Regd. L. No.7243

Phone 8808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1982

اس پرچہ میں :-

۱ ـ پختونستان کی کہانی

۲ ـ قرآن مجید کسطرح مرتب ہوا تھا

(خود قرآن کی رو سے)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ ـ بی ـ گلبرگ ـ ۲ ـ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون
۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۸۶ روپے

شمارہ ۲ | فروری ۱۹۸۲ء | جلد ۳۵

فہرست

۱۔ ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی شوکت ۔ ۔ ۔ ۔ (پرویز) ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
۲۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۴
۳۔ قرآنِ مجید کس طرح مرتب ہوا۔ (خود قرآن کی رو سے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۷
۴۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۶
۵۔ اندھے کی لکڑی ۔ ۔ ۔ (محترم پرویز صاحب) ۔ ۔ ۔ ۱۷
۶۔ مطالب الفرقان حصہ چہارم ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۲
۷۔ نمائندہ "جنگ" کا پرویز صاحب سے انٹرویو ۔ ۔ ۔ ۳۳
۸۔ تصوّف کی حقیقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۸
۹۔ پختونستان کی کہانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۹
۱۰۔ حقائق و عبر ۔ (۱) گناہوں کے مؤاخذہ سے بچنے کی تدبیر (۲) علماء کو اکٹھے ہو جانا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۵۹
(۳) مجلسِ شوریٰ کے غیر مسلم ممبر ـــــ (۴) الھدیٰ کے پروگرام میں خواتین ـــــ
(۵) جدید عائلی قوانین کا نمونہ ـــــ (۶) بیرونِ ملک جانے والے پاکستانی ـــــ
۱۱۔ سلیم کے نام خطوط ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ - اشرف پرنٹنگ پریس، ۹ ایبک روڈ - لاہور

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی شوکتؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور!!

میرے ہفتہ واری درس، دیگر تقریبات کے اجتماعات اور طلوعِ اسلام کی کنونشنوں میں شرکت کرنے والے احباب نے، ایک سرو قامت جوانِ رعنا کو دیکھا ہوگا ــــ ہونٹوں پر ہر وقت معصوم سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں پاکیزہ شادابی۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ اجتماع گاہ کے ایک کنارے پر خاموش کھڑا، ہر شے کا عقابی نظروں سے جائزہ لیتا، اور ہر ایک کی آواز ہی نہیں بلکہ اشارے پر لبیک کہتا، نہایت سبک خرامی سے اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر آتا جاتا دکھائی دیتا۔ یہ تھا قابلِ رشک صلاحیتوں کا پیکر، شوکت پرویز۔ جس کی جوانی، اس دَور میں جبکہ (قرآن کے الفاظ میں) "شرار کر چمٹ جاتا ہے" سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ تھی، اور دل، خلوص، ہمدردی اور محبت کا ایسا آبگینہ کہ جس سے ملا، اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اسی لئے وہ میرا ہی نہیں، میرے احباب تک کا محبوبِ نظر تھا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ وہ ان کا رونقِ محفل تھا۔ وہ جہاں ہوتا زندگی کھلکھلا کر ہنستی دکھائی دیتی۔

مئی ۱۹۸۱ء میں کراچی میں موٹر سائیکل کے ایک حادثہ کا شکار ہوگیا۔ وہاں کے احباب نے نہایت خلوص اور جانفشانی سے اسے سنبھالا۔ تشخیص پر معلوم ہوا کہ بلڈ پریشر بہت بڑھ چکا ہے اور گردے کام نہیں کر رہے جس کی وجہ سے خون زہر آلود ہو رہا ہے۔ یہاں آنے پر ان امراض کے (SPECIALIST) کے زیرِ علاج رہا جنہوں نے اپنے بچوں کی طرح اس کا خیال رکھا۔ میرے حلقۂ احباب میں اچھے اچھے ڈاکٹر اور طبیب ہیں۔ ان کا مشورہ بھی شاملِ تدبیر رہا۔ کامل چھ ماہ تک علاج معالجہ کا یہ سلسلہ نہایت احتیاط اور التزام کے ساتھ جاری رہا۔ کبھی قدرے افاقہ ہوجاتا لیکن مرض قابو میں نہ آیا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب مریض کے دونوں گردے جواب دے جائیں، تو مرض لاعلاج ہوجاتا ہے۔ امریکہ میں مصنوعی گردے لگانے کا ایک تجربہ کیا جا رہا ہے لیکن وہ بھی ابھی تک حتمی نہیں ثابت ہوسکا۔ بہرحال جو کچھ یہاں ممکن تھا، ہم نے وہ سب کچھ کر دیکھا۔

۲۵ دسمبر (یومِ پیدائش قائدِ اعظمؒ کی تقریب پر) میرا قریب دو گھنٹے کا خطاب تھا۔ اس میں اس جواں ہمت نے اپنے فرائض حسبِ معمول سرانجام دیئے۔ نہ کسی قسم کی کمزوری کے آثار، نہ اضمحلال کی کوئی علامت ــــ وہی ہشاش بشاش چہرہ۔ وہی محبت بھری آنکھیں ــــ ... ۲۶/۲۷ دسمبر کی درمیانی شب طبیعت خراب ہوئی، صبح ہسپتال لے گئے۔ بلڈ پریشر ناقابلِ یقین حد تک بڑھ چکا تھا اور خون زہر آلود۔ ہسپتال کے عملہ نے بڑی سرعت، تندہی اور توجہ سے ہر ممکن کوشش کی لیکن ــــ کچھ نہ دوا نے کام کیا ــــ دل پر حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ وہی شوکتؔ جو صبح میرے ساتھ چل کر ہسپتال گیا تھا، میں دوپہر کو اس کی لاش لے کر گھر آگیا ــــ اسی کی نہیں، سارے گھر کی حرکتِ قلب بند ہوگئی، دور نزدیک کہرام مچ گیا۔ کوئی باور نہیں کرتا تھا کہ شوکتؔ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

موت انسان کے لئے ایک معمہ ہے جسے نہ کوئی حل کر سکا ہے، نہ حل کر سکے گا۔ ابھی ابھی میں اسے شوکت بیٹا کہہ کر پکارتا تھا۔ اور ایک ہی سانس کے بعد وہاں شوکتؔ نہیں، شوکتؔ کی لاش تھی ــــ شوکتؔ کون تھا جس کی یہ لاش تھی؟ وہ جہاں چلا گیا ہے وہاں سے اس کی جھلک تک دکھائی نہیں دیگی۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیگی ــــ کبھی نہیں سنائی دیگی ــــ یہی اصل صدمہ ہے۔ ناقابلِ فراموش، امٹ صدمہ!

یوں تو ہر موت اپنے پیچھے صفِ ماتم بچھا جاتی ہے، لیکن جوانا مرگ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ مرنے والا، پرورش، نشوونما، تربیت، تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد، عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھنے والا ہوتا ہے۔ اپنے مستقبل کی زندگی کا جو حیات افروز

نقشہ اس کی نگاہوں میں ہوتا ہے، اس سے قطع نظر اس کے ساتھ اس کے متعلقین کی ہزاروں امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ رسیدہ سن باپ کا عصائے پیری۔ ماں کی آرزؤں کا چاند۔ بہنوں کے چاؤ کا دُلہا۔ بھائیوں کا بازو بننے والا ہوتا ہے۔ کہ موت کا ایک جھٹکا، ان تمام سہاروں۔ آرزؤں۔ تمناؤں۔ امیدوں کے شیشہ کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا ہے۔ شوکت بیٹے کی جوانمرگی نے یہی کیا۔ ہماری امیدوں کے سارے تصورات خواب پریشاں ہو کر رہ گئے۔

مجھ حرماں نصیب کو دیکھئے۔ جون (۱۹۸۱ء) میں مجھے وہ رفیق (شیخ سراج الحق) چھوڑ کر چلا گیا جس نے ساری عمر میرا ساتھ دیا تھا۔ اور چھ ہی ماہ بعد، میرا وہ سہارا مجھ سے چھن گیا جس نے عمر کے اس آخری حصہ میں میرا ساتھ دینا تھا۔ میری کیفیت یہ ہے کہ صبح سے جو میز پر بیٹھتا ہوں تو دوپہر تک سر ہی نہیں اٹھاتا۔ وہ از خود میری ہر ضرورت کو پورا کئے جاتا۔ پھر اس نے گھر کا سارا نظم و نسق سنبھال رکھا تھا۔ اس کی موت سے اس گھر کی چھت کا مرکزی ستون گر گیا اور میں اس کے ملبہ کے نیچے دب گیا۔ ایک کی موت سے یہ بستا رستا گھر اُجڑ گیا۔

وہ میرے لئے کیا تھا، اس کی نشاندہی مجھے اس کلینک کی نرس نے کرائی جس میں، مَیں اسے علاج کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ اس نے ایک دن شوکت سے پوچھا کہ تم اپنے بابا کے اکلوتے بیٹے ہو؟ اس نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس کا احساس کیسے ہوا؟ اس نے کہا کہ میرے تجربہ نے بتایا ہے کہ تمہارے لئے جس قسم کی احتیاط تمہارے بابا برت رہے ہیں اس قسم کی احتیاط وہی باپ برتا کرتے ہیں جن کا اکلوتا بیٹا بیمار ہو۔ شوکت نے اس سے کہا کہ یہ بات تم خود باباجی سے پوچھ لینا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ باباجی! شوکت آپ کا اکلوتا بیٹا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ اکلوتا تو ضرور ہے لیکن بیٹے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہا میں سمجھی نہیں۔ میں نے کہا کہ وہ میرا "دوست" بھی ہے۔ اور جب بیٹا دوست بھی ہو تو اس رشتے کے لئے ابھی تک کوئی لفظ ایجاد نہیں ہوا۔ اس نرس کو اس کا علم نہیں تھا کہ خون کے رشتے کے اعتبار سے، شوکت میرا بیٹا بھی نہیں بھتیجا تھا۔

یہ تھا میرا جواں سال شوکت! نور دیدۂ یعقوب۔ ماں کے جگر کا ٹکڑا۔ بہنوں کی آنکھوں کا تارہ۔ یہ سب کچھ لٹ گیا۔۔۔

اس چراغاں کا کہوں کیا، کارفرما جل گیا۔۔۔۔ شوکت بیٹا!

چاندنی افسردہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اداس ۔۔۔ اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں، کیا کیا ہو گیا!

اس خلا کو کوئی بھی پورا نہیں کر سکے گا ۔۔۔۔۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ اس سا کہیں جسے ؟

———— (۰) ————

میں نے اس المیہ جانگداز کی خبر کو دانستہ عام نہ ہونے دیا کہ اس سے احباب پریشان ہونگے لیکن یہ خود بخود پھیل گئی۔ احباب کی طرف سے جو جگر گداز اور دردناک تعزیت کے خطوط آئے ہیں وہ اس احساس سے وجہ تسکین خاطر ہوئے کہ دنیا میں اس قدر میرے شریک غم موجود ہیں۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان تعزیت ناموں کا فرداً فرداً جواب دوں۔ احباب میری اس معذرت کو قبول فرمائیں اور اس اجتماعی شکریہ کو ان خطوط اور پیغامات کا جواب تصور کریں۔

میں ایک بلند مقصد کی خاطر (جو میری زندگی کا مشن ہے) جیتا ہوں ۔۔۔۔ اس کے سوا میرے لئے دنیا میں کوئی دلکشی نہیں کوئی جاذبیت نہیں۔ میں انتہائی کوشش کروں گا کہ اپنے مشن کو اس ناقابل برداشت صدمہ سے متاثر نہ ہونے دوں اور جب تک فطرت کے قوانین مجھے اجازت اور توفیق دیں، اسے جاری رکھوں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

جگر سوختہ ۔۔۔۔۔ پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

صدرِ مملکتِ پاکستان نے گزشتہ عید میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کے دو گوشے متمیز اور نمایاں ہیں۔ پہلا گوشہ مکی زندگی کا تیرہ سال کا عرصہ ہے اور دوسرا گوشہ مدینہ کی دس سالہ زندگی۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ مکی زندگی وعظ و نصیحت تک محدود تھی، اور مدنی زندگی، اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کے قیام کے لئے سرگرمیوں کا مرحلہ ـــ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ مکی اور مدنی زندگی ایک ہی پروگرام کی دو مسلسل کڑیاں تھیں۔ اسلامی نظام کوئی مشینری نہیں ہوتی کہ اسے کہیں سے درآمد کر کے اپنے ہاں نصب کر دیا جائے تو وہ چلنے لگ جائے۔ اسلامی نظام کی شرطِ اولیں یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو اس نظام کے قیام و استحکام کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ حضورؐ کی مکی زندگی اسی قسم کے افراد تیار کرنے کے لئے وقف رہی، اور جب یہ افراد تیار ہو گئے تو اسلامی نظام کے قیام کے لئے عملی پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔ اس قسم کے افراد کے بغیر اسلامی نظام نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا۔

صدرِ محترم کی تقریر کا یہ ملخّص تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے طلوعِ اسلام تشکیلِ پاکستان کے آغاز سے لے کر آج تک دہرائے چلا آ رہا ہے۔ آپ اس کے شمارہ بابت اگست سنہ ۱۹۵۰ء کے لمعات پر ایک نگاہ ڈالئے۔ ان میں واضح الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان ہنوز ایک خطۂ زمین کا نام ہے جو اس لئے حاصل کیا گیا ہے کہ اس میں اسلامی نظام (یا اسلامی حکومت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ اس کے لئے پروگرام وہی ہے جسے ارشادِ خداوندی کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ ارشادِ خداوندی یہ تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ...... (۱۳/۱۱) (ترجمہ تو ایک طرف) خدا بھی کسی قوم کی خارجی دنیا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا (سیرت و کردار اور نفسیات) میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کا طریق یہ بتایا گیا تھا کہ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ...... (۶۲/۲) قوم کے سامنے خدا کی اقدار و قوانین کو پیش کیا جائے۔ پھر ان قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دی جائے۔ اور اس تعلیم و تربیت کی رُو سے ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کی جائے جو ان کے حسنِ کردار کی بنیاد بنے۔ جب اس قسم کے افراد تیار ہو جائیں تو پھر اسلامی نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔

لیکن ہمارے سانحہ ہوا یہ کہ ان مذہبی جماعتوں نے جنہوں نے آخر تک مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی

کا زور لگا دیا تھا، یہاں پہنچتے ہی یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں —— وہ دن اور آج کا دن، وہ شدّ ومد سے اس مطالبہ کو پیش کئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پہلے افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے جس سے ان میں ایسا قلبِ ونفس پیدا ہو جائے کہ وہ اسلامی نظام کے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ انہیں اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ہماری قوم کس قسم کی ہے۔ یہ انہی نے تو کہا تھا کہ

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق وباطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں —— نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے...... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں حقیقی معنوں میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا، اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔
>
> (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۰ از سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم)

نیز یہ کہ

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب ویابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں موجود ہیں۔ (ص ۱۴۶)

اس قسم کی قوم میں "اسلامی قوانین" نافذ کر دینے کا نتیجہ، مایوسی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس پروگرام سے جس قدر مایوسی پیدا ہو چکی ہے، اس کا مظاہرہ خود صدرِ مملکت اپنی تقاریر میں کئی بار کر چکے ہیں اور ملک میں جو عام مایوسی پھیل رہی ہے اس کا چرچا ہر ایک کی زبان پر ہے۔ صدر صاحب ان قوانین کو ناقابلِ عمل قرار دے چکے ہیں۔ ملک میں اس قسم کے یاس انگیز حالات پیدا کرنے سے ان حضرات کا منشا کیا تھا، اسے بھی یہ خود ہی واضح کر چکے ہیں۔ جب ۱۹۷۶ء میں، ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مرحلہ درپیش تھا اور اس کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی تھی تو (مودودی مرحوم نے) وکلا کانفرنس میں کہا تھا کہ

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں۔ دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں۔ اور جس روز اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔ (ایشیا۔ ۹؍مئی ۱۹۷۶ء)

یعنی ملک میں تھیاکریٹک نظام نافذ کر دیا جائے۔ اس وقت عملاً یہی حالت ہو چکی ہے جس کا لازمی نتیجہ مایوسی ہے

لیکن اس مایوسی کو اب بھی امید میں بدلا جا سکتا ہے۔ صدر مملکت نے اپنی محولہ بالا تقریر میں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نظام اسلام کے قیام کے لئے حضورؐ نے کیا پروگرام اختیار فرمایا تھا۔ اس تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ

یہی حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے جس کے اتباع میں ہماری نجات کا راز مضمر ہے۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ صدر مملکت کے سامنے ہے' اور انہیں اس کا بھی اعتراف (بلکہ اس پر ایمان) ہے کہ اسی اسوہ کے اتباع میں ہماری نجات کا راز مضمر ہے' تو اگلی بات یہی رہ جاتی ہے کہ جو کچھ سمجھا اور کہا گیا ہے' اس پر عمل بھی کیا جائے۔ یہ الفاظ کسی واعظ کے تو ہیں نہیں کہ الفاظ سے آگے اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ الفاظ اس صدر مملکت کے ہیں جو اس اقتدار کا مالک ہے جس کی رو سے ان الفاظ کو بغیر کسی رکاوٹ کے عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ قوانین سازی اور نفاذِ قانون کے عمل کو کچھ وقت کے لئے ملتوی کر دیں اور اس تعلیم و تربیت کا انتظام کریں جس کی رو سے اقتدارِ خداوندی ہمارے نوجوان طبقہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ (اس کے متعلق ہم نے، موجودہ حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد، اگست ۱۹۷۸ء میں بھی لکھا تھا اور پھر اگست ۱۹۸۰ء میں بھی)۔ اس وقت "اسلامی تعلیم" کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ قطعاً اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے تو اس نظام کی بنیادوں تک کو بدلنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اسلام کی طرف سے مایوسی بھی بڑھتی جائے گی اور ملک میں بدعنوانیاں اور بدکرداریاں بھی عام ہوتی جائیں گی۔ ان کا ازالہ پھر کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔

-(o)-

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد ۵۰/- روپے
مکمل سیٹ مجلد ۱۵۰/- روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد ۴۰/- روپے
مکمل سیٹ ۱۵۰/- روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام بی ۲۵/ گلبرگ ۲ لاہور۔ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قرآنِ مجید

(خدا کی آخری، مکمل — اور — غیر محرّف کتاب)

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۸۲ء میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے —— "پھر قرآن مجید کی باری آئی"...... اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف جو بھی سازشیں ہوئیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک سازش یہ تھی کہ یہ تاثر دیا جائے کہ قرآنِ مجید کی محفوظیت بھی مشکوک ہے۔ ہم نے اس مقالہ کے آخر میں لکھا تھا کہ

> یاد رکھیئے! یہ تمام روایات وضعی اور ایک بڑی گہری سازش کا نتیجہ ہیں۔ ہم کسی دوسری نشست میں واضح کریں گے کہ قرآنِ کریم، بغیر کسی اختلاف کے، خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ اسے خود نبی اکرمؐ نے اسی طرح مرتب کر کے اُمّت کو دیا۔ اور وہی قرآن بغیر ایک حرف کے تغیّر و تبدّل کے مکمل شکل میں اُمّت کے ہاں متداول چلا آرہا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ، جو پیئتر بز صاحب کی کتاب —— "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" —— سے مقتبس ہے، اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ اس مقالہ میں خود قرآنِ مجید سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ کتاب عہدِ رسالتمآبؐ میں ہی منضبط اور محفوظ ہو گئی تھی۔ جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے اس کے لیئے، قرآن کی شہادت کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ باقی رہے غیر مسلم، سو ان ...... کے اطمینان کے لیئے، غیر مسلم محققین اور مؤرّخین کی چند ایک شہادات درج مقالہ ہیں، امید ہے اس سے ان شبہات کا ازالہ ہو جائے گا جنہیں مذکورہ بالا سازش نے وضعی روایات کی رُو سے پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔

—— (٠) ——

اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیئے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا۔ یہ نبی دنیا کی ہر قوم میں اور ہر زمانے میں آتے رہے۔ نبی کو جو تعلیم وحی کے ذریعے سے ملتی تھی وہ اس کی کتاب کہلاتی تھی۔ جہاں تک اس تعلیم کے اصولوں کا تعلق تھا، یہ شروع سے اخیر تک ایک ہی چلے آرہے تھے۔ لیکن ان اصولوں کی روشنی میں جو احکام دیئے جاتے تھے، وہ اس قوم کی حالت کے مطابق ہوتے تھے جس قوم کی طرف وہ نبی آتا تھا۔ وہ نبی اپنی قوم تک خدا کے پیغامات پہنچاتا ان پر عمل کر کے دکھاتا اور پھر اپنے وقت پر دنیا سے چلا جاتا۔ لیکن اس کے بعد، وہ قوم اس کتاب میں ردّ و بدل شروع

کر دیتی۔ بعض اوقات وہ، کسی خارجی حادثہ کی وجہ سے، ضائع ہی ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور نبی آجاتا۔ وہ پھر آسمانی تعلیم کو اس قوم تک پہنچاتا۔ اس کی تعلیم اصولی طور پر تو وہی ہوتی جو سابقہ نبی کی تھی۔ لیکن اگر زمانے کے تقاضے کے مطابق سابقہ نبی کی تعلیم کے احکام میں سے کسی میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو اس کی جگہ تبدیل شدہ حکم دے دیا جاتا۔ یہ اس نئے نبی کی کتاب کہلاتی۔ یہ سلسلہ، دنیا کی ہر قوم، اور ہر زمانے میں جاری رہا۔ لیکن ان کی کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی دنیا میں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ یعنی اس شکل میں موجود نہیں جس میں ان کے نبی نے انہیں دیا تھا۔

نزولِ قرآن کے وقت

ان کتابوں کی حالت آج ہی ایسی نہیں ہوئی۔ چھٹی صدی عیسوی میں، ان کی حالت ایسی ہی ہو چکی تھی۔ یعنی اس وقت دنیا کی کسی قوم کے پاس، آسمانی کتاب، اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں تھی۔ بالفاظِ دیگر، اس وقت وحی کی تعلیم دنیا میں کہیں بھی اپنی خالص، منزہ شکل میں باقی نہیں رہی تھی۔ اس وقت خدا نے، اسی سلسلہ کے مطابق، جو شروع سے چلا آرہا تھا، ایک نبی بھیجا اور اس کے ذریعے آسمانی تعلیم ایک بار پھر، انسانوں تک پہنچی۔ لیکن اس نبیؐ، اور اس کی کتاب کی کچھ امتیازی خصوصیات تھیں یعنی:۔

(۱) سابقہ انبیائے کرامؑ صرف اپنی اپنی قوم کی طرف آتے تھے۔ لیکن اس نبی کو تمام دنیا کے انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۷/۱۵۹)

کہدے۔ اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

(۲) جب "نوعِ انسان" کہا گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں قیامت تک کے آنے والے انسان شامل تھے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کردی کہ اگرچہ اس رسول کی اوّلین مخاطب وہی قوم ہے جس میں یہ پیدا ہوا ہے لیکن یہ، ان کے علاوہ ان انسانوں کے لئے بھی رسولؐ ہے جو ان کے بعد آنے والے ہیں۔

وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ...... (۶۲/۳)

اور ان کے علاوہ ان کی طرف ـــــ بھی جو ابھی ان لوگوں سے نہیں ملے۔ (یعنی ان کے بعد آنے والے انسانوں کی طرف بھی)۔

تمام سابقہ کتابوں کی مہیمن

چنانچہ جو کتاب اس رسولؐ کی طرف بھیجی گئی اس میں وہ ساری تعلیم یکجا کر دی گئی جو اصولی طور پر کتبِ سابقہ میں وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی تھی لیکن جو اُس وقت دنیا میں کہیں موجود نہ تھی۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ...... (۵/۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی۔ یہ ان تمام دعاوی کو سچ کر کے دکھائے گی جو کتبِ سابقہ میں کئے جاتے رہے ہیں۔ اور ان تمام کتابوں کی تعلیم اس کے اندر آگئی ہے۔

(۴) یہ بھی ضروری تھا کہ جو احکام اس کتاب میں دیئے جاتے وہ صرف اس قوم کی حالت کے مطابق نہ ہوتے جو اس رسولؐ کی اوّلین مخاطب تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی کے حالات اور تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر دیئے جاتے اور اس شکل میں دیئے جاتے کہ ان میں پھر کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ نیز، اس میں وہ سب تعلیم جو تمام نوعِ انسان کو دی جانی مقصود تھی، مکمل شکل میں منضبط ہوتی۔ کیونکہ اس کتاب کو ہمیشہ کے لئے بطورِ ضابطۂ حیات رہنا تھا۔ یعنی وہ مکمل بھی ہوتی اور غیر متبدّل بھی۔ یہ کتاب ایسی ہی ہے۔

مکمّل اور غیر متبدّل

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۵) تیرے رب کی طرف سے دیئے جانے والے احکام و قوانین، صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں۔

(۵) جو کتاب ہر طرح سے مکمل ہو۔ اس میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہ ہو، وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آسمانی ہدایت ہو۔ اس کا محفوظ رہنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس کتاب کی

محفوظ

حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

ہم نے اس ضابطۂ ہدایت کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس قسم کی حفاظت کہ کوئی غیر خداوندی بات اس کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲)

باطل اس کے آگے یا پیچھے، کہیں سے بھی اس کے پاس نہیں آ سکے گا۔

اس رسول کا نام ہے، محمدؐ۔ اور اس کتاب کا نام قرآن۔ جو چھٹی صدی عیسوی میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور جسے مسلمانوں کی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ درحقیقت تمام نوعِ انسان کی آسمانی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی، خدا کی طرف سے آتا ہی اس لئے تھا کہ وہ خدا کی وحی انسانوں تک پہنچائے۔ جب وہ وحی اپنی مکمل غیر متبدّل۔ اور محفوظ شکل میں انسانوں کے پاس موجود ہو تو پھر کسی نبی کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

ختمِ نبوّت

چنانچہ، اس رسولؐ کے بعد نبوّت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور آپؐ سے خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳/۴۰) کہہ کر پکارا گیا۔

یہ ہے وہ کتاب (قرآنِ مجید) جو اپنی اصل اور حقیقی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور جس میں ایک حرف کا ردّ و بدل نہیں ہوا۔ اس دعوے کی تصدیق خود اس کتاب کی داخلی شہادات اور تاریخ کے بیانات کرتے ہیں۔ پہلے داخلی شہادت کو لیجئے۔

———— (۰) ————

کتابت کا رواج

زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں میں کتابت (لکھنے پڑھنے) کا رواج اتنا عام تھا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)

جب تم کسی مدت کے لئے لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو"۔ اس کے بعد اس آیت میں اس لکھت پڑھت کے لئے تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حکم اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہو۔ معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی اہمیت یہ کہہ کر واضح کی کہ یہ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ ہوتا ہے۔ (۲/۲۸۲) یعنی اس سے شہادت محکم ہو جاتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جس قوم کو عام لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا ایسا تاکیدی حکم دیا گیا تھا اس قوم نے اپنی آسمانی کتاب کو تحریر میں لانے کے لئے کیا کیا اہتمام نہیں کئے ہوں گے جو اس کے لئے ضابطۂ زندگی تھی اور جس کی راہنمائی کی اسے قدم قدم پر ضرورت پڑتی تھی۔ یہ کتاب ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی تھی۔ نبی اکرمؐ کی تیئیس سالہ نبوت کی زندگی میں، تدریجاً نازل ہوئی تھی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ..... (۲۵/۳۲)

کفار اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قرآن، اس رسول پر (پورے کا پورا) ایک ہی بار کیوں نہ نازل ہوگیا۔

قابلِ اعتماد کاتب

جوں جوں وحی نازل ہوتی تھی، اسے نہایت احتیاط سے ضبطِ تحریر میں لے آیا جاتا تھا۔ صحابہؓ اسے اپنے اپنے طور پر بھی لکھتے تھے لیکن بابِ نبوت کی طرف سے اس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور اس عظیم ذمہ داری کے لئے نہایت قابلِ اعتماد کاتبوں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا، جو نہ صرف فنِ کتابت ہی کے ماہر ہوں بلکہ سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی رفیع المنزلت ہوں۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ... (۸۰/۱۳-۱۶)

(یہ وحی) ایسے صحیفوں میں محفوظ کر دی جاتی ہے جو نہایت واجب العزت ہیں۔ رفیع الشان اور ہر قسم کی غلطیوں اور آمیزیوں سے پاک اور صاف۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو معاشرہ میں بڑی ہی عزت و تعظیم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

حفاظت کی غرض سے اسے عام طور پر ان اوراق پر لکھا جاتا تھا جو (اس زمانے کے رواج کے مطابق) باریک کھال (رق) سے بنائے جاتے تھے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ...... (۵۲/۲-۳)

پھیلے ہوئے رق پر لکھی ہوئی کتاب۔

اس طرح یہ وحی ایک کتاب کے اندر محفوظ ہوتی چلی جاتی تھی۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ...... (۵۶/۷۷-۷۸)

یہ باعزت قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب کے اندر۔

رسول اللہؐ اَن پڑھ نہیں تھے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ اَن پڑھ تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یہ صحیح نہیں۔ نبوت سے پہلے تو بے شک آپ کی یہی کیفیت تھی۔ لیکن نبوت کے بعد یہ بات نہیں تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ... (۲۹/۴۸)

اس (نبوّت) سے پہلے نہ تو کتاب پڑھنا جانتا تھا نہ اپنے ہاتھ سے لکھنا۔

مِنْ قَبْلِهٖ ۔ (اس سے پہلے) کی تخصیص اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ نبوّت کے بعد حضورؐ کی کیفیت ایسی نہیں رہی تھی۔ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

اس کتاب کی تلاوت مسلمانوں کے گھروں میں عام ہوتی تھی (یعنی اکرمؐ کے اہل خانہ کے متعلق قرآن میں ہے:۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ .... (۳۳/۳۴)

(اے نبی کی بیویو!) جو کچھ تمہارے گھروں میں، احکامِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت (حکمت) کے متعلق (قرآن سے) پڑھا جاتا ہے، اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔

حفّاظ

اس وحی کو نہ صرف کتاب کے ذریعے محفوظ کیا جاتا تھا، بلکہ اسے لفظ بلفظ حفظ بھی کیا جاتا تھا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ..... (۲۹/۴۹)

یہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینے میں (محفوظ) جنہیں (وحی کا) علم دیا گیا ہے۔

اِس طرح اس کتاب کی دُہری حفاظت کی جاتی تھی۔ ــــ بذریعہ تحریر اور بذریعہ حفظ ــــ ظاہر ہے کہ جو چیز اس طرح محفوظ کی جائے نہ اس میں کسی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے نہ اس کے تلف ہونے کا خطرہ۔ یہ کتاب خود ان لوگوں کی زبان میں تھی اور اس کا اندازِ بیان نہایت واضح تھا۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ .... (۲۶/۱۹۵) اس لئے ان لوگوں کو نہ اس کے لکھنے یا حفظ کرنے میں کوئی دقت پیش آتی تھی نہ اس کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی مشکل ــــ ـ اس کی تلاوت ہر گھر میں ہوتی تھی اور اس کا چرچا ہر جگہ۔ وہ سفر و حضر میں اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے کیونکہ یہ زندگی کے ہر گوشے میں ان کے لئے ضابطۂ حیات تھی اور انہیں ہر مقام پر اس سے راہ نمائی لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

اس طرح یہ کتاب ساتھ کے ساتھ محفوظ ہوتی گئی اور جب نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو یہ بعینہٖ اسی شکل اور ترتیب میں جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس ہے، لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود، اور ہزاروں سینوں میں محفوظ تھی اس کی مستند کاپی (MASTER COPY) مسجدِ نبویؐ میں ایک ستون کے قریب، صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی اکرمؐ سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے۔ اسے امام یا اُم کہتے تھے اور اس ستون کو جس کے قریب یہ نسخہ رہتا تھا "اسطوانۂ مصحف" کہا جاتا تھا۔ اسی ستون کے پاس بیٹھ کر، صحابہ کرامؓ نبی اکرمؐ کی زیرِ نگرانی، اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہو چکی تھی کہ جب نبی اکرمؐ نے اپنے آخری حج (حجّۃ الوداع) کے خطبہ میں، لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے، تو چاروں طرف سے یہ آواز گونج اٹھی کہ ہاں! آپؐ نے اسے پہنچا دیا ہے۔ یہی تھی وہ کتاب، جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے، نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں، دیگر صحابہؓ کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ ــــ حسبنا کتاب اللہ۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے ــــ اور جس کے شک و شبہ

سے بالاتر ہونے کے متعلق، خود اس کی اپنی شہادت موجود ہے۔ چنانچہ، قرآن کریم کی تمہید (سورۂ فاتحہ) کے بعد، پہلی سورت (سورۂ بقرہ) کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ .... (۲/۲)

خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کی شک والی بات نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن کو مرتب شکل میں دے کر نہیں گئے تھے اور اس کو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جمع اور مدوّن کیا گیا تھا، یہ صحیح نہیں۔ "کتاب" تو کہتے ہی اُسے ہیں جو مرتب شکل میں موجود ہو۔ علاوہ ازیں خود ہماری کتبِ روایات میں بکثرت شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں قرآن کریم اسی ترتیب کے ساتھ، مدوّن شکل میں موجود تھا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں، اس کی عام نشر و اشاعت ہوئی۔ البتہ ایک ضرورت واضح تھی۔ افرادِ اُمّت کے پاس قرآن کے اپنے اپنے نسخے تھے۔ مدینہ میں مستند صحیفہ (MASTER COPY) موجود تھا۔ اس لئے اہلِ مدینہ کو اس باب میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اپنے نسخوں کو اس مستند صحیفے سے ملا کر، اپنے نسخہ کی صحت کے متعلق مطمئن اور متیقن ہو جائیں۔ لیکن باہر والوں کو اس میں دقت پیش آسکتی تھی۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ قرآن کریم کے مستند نسخے، مختلف مراکز میں موجود ہوں۔ یہ نسخے حکومت کی طرف سے مرتب کر کے بھیجے جاتے تھے۔ لوگ ان نسخوں سے مقابلہ کر کے اپنے اپنے نسخوں کی تصحیح کر لیتے تھے۔

قرآن کے لاکھوں نسخے

امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفۂ اوّل کے زمانے میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں لوگوں کے پاس بکثرت قرآن کریم کے نسخے نہ ہوں۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں، مسلمانوں کے پاس اس کتابِ عظیم کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الفصل، الملل والنحل)۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں جو سات (بابعض روایات کے مطابق آٹھ) مستند اور مصدقہ نسخے مرتب کرائے تھے۔ اور ان میں سے ایک مدینہ میں رکھ کر باقی مختلف شہروں میں بھیجے تھے، ان کی تفصیل کتبِ تاریخ میں موجود ہے۔

ضمناً اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرت عثمانؓ کو جو "جامع القرآن" کہا جاتا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ آپ جامع القرآن نہیں تھے۔ دیگر خلفاء کی طرح، ناشرِ قرآن ہی تھے۔ انہوں نے البتہ اس کا اہتمام ضرور کیا تھا کہ کہیں کوئی ایسا نسخہ نہ رہے جو ان مستند اور مصدقہ نسخوں کے مطابق نہ ہو۔ اور ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ لوگوں نے جو نسخے اپنے اپنے طور پر مرتب کئے تھے ان میں سہو اور خطا کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں چھاپے خانے تو تھے نہیں کہ حکومت، اپنی زیرِ نگرانی، قرآن کریم کے لاکھوں نسخے چھپوا کر تقسیم کر دیتی، اور اس طرح غیر مصدقہ نسخے باقی نہ رہتے۔ اس کے لئے یہی انتظام کیا جا سکتا تھا کہ مصدقہ نسخے مختلف مراکز میں بھیج کر ہدایت کر دی جاتی کہ لوگ ان کے مطابق اپنے لئے نسخے مرتب کر لیں۔ اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہو جو ان کے مطابق نہ ہو، اسے تلف کر دیا جائے تاکہ کسی ایسے نسخے کی اشاعت نہ ہونے پائے جس میں کوئی غلطی ہو۔

حضرت عثمانؓ کے مصدقہ نسخے

حضرت عثمانؓ نے اپنے مستند نسخوں میں سے جو نسخہ مدینہ میں رکھا تھا (جسے امام کہتے تھے اور جو آپ کی شہادت کے وقت آپ کے سامنے موجود تھا) اس کا سراغ قریب قریب مسلسل اور مربوط اطلاعات کے ذریعے چوتھی صدی ہجری تک ملتا ہے۔ (اس کے بعد تاریخی بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے) چنانچہ تیسری صدی کے ایک محقق، ابو عبیدہ ابو القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۳ھ) نے (کتاب القرآت میں) بیان کیا ہے کہ اس نے اس مصحف کو خود دیکھا تھا۔ مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے اسے (آٹھویں صدی ہجری میں) بصرہ میں دیکھا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں، (ابو تیمور کے زمانے میں) ابو بکر الشاشی نے اسے حضرت عبداللہ کے مزار پر رکھ دیا۔ جب روس میں بالشویک حکومت قائم ہوئی تو یہ نسخہ ان کے ہاتھ آگیا۔ اس کے متعلق ۱۹۵۹ء میں روس کے ایک رسالہ (سوویٹ دیس) میں جو اطلاعات شائع ہوئی تھیں ان میں کہا گیا تھا کہ یہ (مصحف عثمانی) تیمور کے کتب خانہ میں تھا جو ۱۳۹۳ء میں سمرقند میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کن حالات کے تحت، یہ نسخہ اس کتب خانے سے نکل کر سمرقند کی مسجد خواجہ احرار میں آگیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک مرمری ستون سے، زنجیروں کے ساتھ معلق رہا۔ ۱۸۶۸ء میں روسی شہنشاہیت بخارا پر قابض ہوئی تو روسی گورنر جنرل (وان کاف مان) نے اسے خرید کر، پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں تحفۃً بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد، یہ نسخہ، حکومت کے ایک فرمان کے مطابق، روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں کے ایک جلسہ میں اوفا پہنچا۔ پھر اسے تاشقند لایا گیا۔ روسی نشریہ میں اس نسخہ پر، حضرت عثمانؓ کے خون کے نشانات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ روسی مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کرلی ہے۔

۱۹۶۵ء میں ایک پاکستانی وفد، زیر قیادت (اس زمانے کے صدر مملکتِ پاکستان) محمد ایوب خان (مرحوم) روس گیا تھا۔ وہاں انہیں اس مصحف کا ایک مکمل عکسی نسخہ بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

۱۴ مارچ ۱۹۷۶ء کے روزنامہ ڈان (کراچی) میں (H. A. HAMIED) صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس نمائش کتب کی تفصیل دی تھی جو نیشنل میوزیم (کراچی) میں انٹرنیشنل سیرت کانگریس کی تقریب پر منعقد کی گئی تھی، اس میں مصحفِ عثمانی کا وہ عکسی نسخہ بھی تھا جسے صدر ایوب خان (مرحوم) روس سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس ضمن میں صاحبِ مقالہ نے لکھا تھا:-

> قرآنِ کریم کا یہ نسخہ، جو قدیم کوفی رسم الخط میں مرقوم ہے، وہ ہے جسے خلیفۂ ثالث (حضرت عثمانؓ) نے مصر بھیجا تھا، اور اس کے بعد وہ بغداد پہنچ گیا تھا۔ ... بعد ازاں اسے حضرت شیخ ابو بکر محمد بن علی القیفل الشاشانی نے، جن کی اہل بغداد کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت تھی، بطور تحفہ تاشقند بھیج دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت یہ نسخہ ان کے زیرِ تلاوت تھا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (مرحوم) روس تشریف لے گئے ہیں تو انہیں یہ نسخہ تحفتہً دیا گیا تھا۔

یعنی اب وہ عکسی نسخہ نیشنل لائبریری، کراچی کی وجہ زینت و افتخار ہے۔

ایک نسخہ مدینہ میں موجود تھا جسے جنگِ عظیم میں ترکی گورنر فخری پاشا، دوسرے متبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گئے تھے۔ اور اب کہا جاتا ہے کہ وہاں موجود ہے۔

ایک نسخہ کے متعلق مولانا شبلی نعمانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ انہوں نے اسے جامعہ دمشق میں (غالباً ۱۸۹۲ء میں) دیکھا تھا۔

ایک نسخہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فاس میں ہے۔ ایک کتب خانہ خدیویہ (مصر) میں۔ ایک نسخہ جو کوفہ بھیجا گیا تھا، قسطنطنیہ میں ہے۔ ایک نسخہ لندن میں ہے۔

ان نسخوں کی تاریخی تحقیقات کے متعلق مبسوط مقالہ، پرویز صاحب کی کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" کے آخیر میں ثبت ہے۔ اربابِ ذوق کے لئے اس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

ان کے علاوہ، متعدد صحابہ رضؓ کے لکھے ہوئے نسخے، ہندوستان۔ ایران۔ مصر۔ عرب اور ترکی کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں ملتے ہیں۔

لیکن اگر (بفرضِ محال) یہ نسخے اس وقت موجود نہ بھی ہوتے تو بھی قرآنِ کریم کی صحت کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک، مسلمانوں کی عام آبادی ہی نہیں، بلکہ ان کی سلطنتیں، مختلف ملکوں میں مسلسل اور متواتر چلی آرہی ہیں۔ قرآن پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ اس کا کم از کم ایک نسخہ ہر گھر میں موجود رہتا ہے۔ اس کی تعلیم ہر بچے کو دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق (تفسیر وغیرہ کے ہر سلسلہ میں) شروع سے آج تک ہزارہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تمام دوران میں قرآن کریم کے کسی ایک نسخے کا سراغ تک نہیں ملتا جو دوسرے نسخوں سے مختلف ہو۔ علاوہ بریں، رسول اللہؐ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں قرآن کے حافظ، مسلسل اور پیہم چلے آرہے ہیں۔ ہر سال کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں (رمضان المبارک) میں قرآنِ کریم کو دہرایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ بھی صحابہ رضؓ کے زمانہ سے متواتر چلا آرہا ہے۔ ان حالات میں کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ قرآنِ کریم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں اُمت کے پاس مسلسل چلا آرہا ہے؟

یہ تو قرآنِ کریم کی داخلی شہادات تھیں۔ جہاں تک خارجی تحقیق کا تعلق ہے مشہور مستشرق (HORTNIG — HIRSCHFELD) اپنی کتاب — (NEW RESEARCHES INTO THE COMPOSITION AND EXEGESES OF THE QURAN) میں لکھتا ہے:-

عہدِ حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زیدؓ نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جسے محمدؐ نے (لکھا کر) دیا تھا۔

سر ولیم میور جیسا متعصب اہلِ قلم، اپنی کتاب — (LIFE OF MOHAMMAD) میں لکھتا ہے:-

یہ یقینی بات ہے کہ قرآن جس شکل میں ہمارے پاس اس وقت موجود ہے یہ بعینہٖ اسی شکل میں، (حضرت) محمدؐ کی زندگی میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا۔

کچھ سال اُدھر، سر جان ہمرٹن کے زیرِ اہتمام، یونیورسل انسائیکلوپیڈیا، گیارہ جلدوں میں شائع ہوا تھا "قرآن"

کے عنوان سے جو مقالہ درج ہے، اس میں تحریر ہے:۔

یہ کتاب، پیغمبر محمدؐ پر، ان کی زندگی کے آخری تیئیس ۲۳ سال میں مکہ اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے۔ بہ خلاف حدیث کے جو مجموعۂ کلام رسولؐ ہے۔ قرآن پیغمبرؐ کی زندگی ہی میں اور انہی کی زیرِ ہدایت و نگرانی ضبطِ تحریر میں آ گیا تھا اور ان کے صحابیوںؓ نے اسے حفظ یاد کر لیا تھا۔ اور یہ معمول آج تک جاری ہے۔ چنانچہ صدہا مسلمان کلامِ پاک کے حافظ ہیں اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں بغیر کسی ایک غلطی کے۔

اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آ گئے ہیں اور یہ کہ وہ آخری اور ناقابلِ تغیر کتاب ہے۔ نیز یہ کہ نوعِ انسان کے لئے وہ جامع ترین دستور العمل ہے، اور یہی دین ابراہیمؑ و موسےٰؑ و عیسےٰؑ (علیہم السلام) اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے۔

ان کے علاوہ ایک حالیہ شہادت، ان سب سے زیادہ واضح ہے۔ پیرس کے ڈاکٹر (MAURICE BUCAILLE) نے ایک شہرۂ آفاق کتاب[1] لکھی ہے جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس میں اس نے بتایا ہے کہ تخلیق و نظامِ کائنات کے متعلق جو کچھ بائبل میں آیا ہے، عصرِ حاضر کے سائنٹیفک انکشافات ان سب کی تردید کرتے ہیں لیکن جو کچھ قرآن مجید نے کہا ہے، یہ انکشافات اس کی تائید و توثیق کرتے ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے جس کے متعلق طلوعِ اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں، ایک مستقل باب ہے۔ "قرآن کے مستند ہونے کا ثبوت۔ ——— یہ کس طرح مرتب ہوا تھا" اس میں اس نے مختلف شہادات سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب شروع ہی میں مرتب اور محفوظ ہو گئی تھی اور اب تک غیر محرف چلی آ رہی ہے۔

اپنوں کی نہیں، بلکہ غیروں کی ان شہادات کے بعد، کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم بعینہٖ اسی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے جس شکل میں اسے نبی اکرمؐ نے اُمت کو دیا تھا۔

شیعی دنیا کے نامور فاضل، شیخ محمد حسین ——— الکاشف الغطا کی کتاب "اصل الشیعہ و اصولھا" کا اُردو ترجمہ "اصل و اصولِ شیعہ" ——— رضا کار بک ڈپو لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

> وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگارِ عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور اس کے ذریعے احکامِ دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ مسلمانوں میں جو لوگ تحریف کے قائل ہیں وہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ اس اعتقاد سے نصِ قرآنی ——— اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ——— کی تردید ہوتی ہے۔

---

[1] کتاب کا نام ہے:۔ (THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے:۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :۔	نوٹ :۔ پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپس بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔
لاہور	جمعہ ہر ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۱ بجے صبح	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.	
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	535 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P5. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۲ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور	ہر جمعہ ۵ بجے شام / ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق ٹین صدر (OPP VIR MAN GATE) پشاور سٹی، ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ جہانگیر آباد۔ فون ۴۴۶۵۹	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ آکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیہ)	
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد)	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چک واٹر سپلائی مکان نمبر۔ نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی ضیائی شفاخانہ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔	
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو ہیلتھ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ متصل لائنز	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	بمقام ۱/۱۲ بی رحیم روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)	
پنجکسی تحصیل پیر والا	ہر جمعہ ۲ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۲۶)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/۲ پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۲۸۵۵)	

لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ... (۷/۱۷۹)

(وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے کے اندھے رہتے ہیں۔)

اندھے کی لکڑی

(ازل سے تا امروز)

پرویز

سلیم کے نام خط

اندھے کی لکڑی

پرویزؔ

تمہیں سلیم! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں بچپن کے زمانے سے ہم انہیں اسی طرح دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اس زمانے میں اُن کی تعداد کچھ کم تھی، اب زیادہ ہو گئی ہے۔ نیز اُس وقت "سب سے آگے چلنے والے" کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا، اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور روزمرّہ کی مشق کے زور پر اپنے پیچھے اندھوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔ جب میں نے انہیں پہلے پہل دیکھا ہے تو سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر، اُس سے پچھلے اندھے کو ترقی (PROMOTICN) مل گئی اور وہ اُن کا راہ نما بن گیا اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اضافہ ہو گیا۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے "دلیلِ راہ" یا "مشعلِ ہدایت" بن گئی۔ جس طرف اگلا مڑا، پچھلے بھی مڑ گئے۔ جہاں وہ ٹھہرا، یہ بھی ٹھہر گئے۔ جس قسم کی آواز اس نے نکالی انہوں نے بھی اس کی نقل اتار دی۔ یہ صبح ایک وقت پر بھیک مانگنے کے لئے نکلتے ہیں اور دن بھر مقررہ راستوں پر چلتے، شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کی مستقل روش ہے جس پر یہ عمر بھر چلتے رہتے ہیں اور چلتے چلتے بالآخر قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور چونکہ ساتھ کے ساتھ لائن میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے ان کا سلسلہ دراز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی لائن بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی۔ نہ ان کی آواز بدلتی ہے نہ رفتار۔ جب کبھی ان میں سے کسی پچھلے سے پوچھئے کہ تم اس راستے پر کیوں جا رہے ہو تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا ہے کہ اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے، اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر چلا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ ہمیشہ مر چکا ہے اس لئے یہ آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

اندھوں کی قطار

غور کرنے پر تمہیں نظر آجائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہِ انسانیت پر، روزِ ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آرہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ

ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔ ان آنکھوں والوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے حضرت نوحؑ آتے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا: یٰقَوۡمِ

حضرت نوحؑ

اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ..... (۲۳/۲۳) اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانین خداوندی کی اطاعت اور محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انہوں نے نہ تو اسے قبول ہی کیا اور نہ ہی اس کی تردید میں کوئی دلیل اور برہان پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِيۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۲۳/۲۴﴾ ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں جس پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد ہم حضرت صالحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ..... (۱۱/۶۱) اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اَتَنۡهٰنَاۤ اَنۡ نَّعۡبُدَ مَا يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا ..... (۱۱/۶۲) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے،

حضرت صالحؑ

تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے؟ یعنی وہی آبا جنہوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ان کے لئے دلیل اور سند بن گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا پہلے مر جائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ مَا هٰذِهِ

حضرت ابراہیمؑ

التَّمَاثِيۡلُ الَّتِيۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا عٰكِفُوۡنَ ﴿۲۱/۵۲﴾ ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم جھکتے ہو؟ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہو۔ سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے؟ اس کے جواب میں ان اندھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے: قَالُوۡا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيۡنَ ﴿۲۱/۵۳﴾ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ کو غصہ تو بہت آیا (اور ہر سمجھدار کو غصہ آئے گا) لیکن ان عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ: لَقَدۡ كُنۡتُمۡ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ فِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۱/۵۴﴾ تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن "کھلی ہوئی گمراہی" تو اسے ہی نظر آ سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے

سہارے چلا جا رہا ہو اُسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے۔ جو آنکھیں بند کر لے اُسے سورج کی روشنی کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

حضرت شعیبؑ

اور وہ دیکھو سلیم! قومِ مدین سے حضرت شعیبؑ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔۔۔۔۔۔ (۱۱/۸۴) اطاعت اور محکومی صرف خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے؟ وہی جو ان سے پہلے دور کے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۔۔۔۔۔۔ (۱۱/۸۷) اے شعیبؑ! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے ــــــ وہی اندھے کی لکڑی!

حضرت موسیٰؑ

دعوتِ حق و صداقت کے جواب میں یہی کچھ حضرت موسیٰؑ کے مخالفین نے کہا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔۔۔۔۔۔ (۱۰/۷۸) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا رہا ہے؟ اندھے، اس کے سوا کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ اُن کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برہان نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دلیل و برہان تو اس کے پاس ہوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر اپنے انتخاب سے اختیار کیا ہو۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رہا ہو کہ اس کے آباؤ اجداد اسی راستے پر چلا کرتے تھے، اس کے لئے دلیل و برہان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جاتا تو انہی کے راستے پر چلنے لگتا۔

یہ تو انبیائے سابقہؑ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپؐ کو بھی اس کا یہی جواب ملا جو پہلے انبیاءؑ کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضورؐ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ مَا هٰذَآ إِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ أَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۔۔۔۔۔۔ (۳۴/۴۳) یہ شخص چاہتا ہے کہ جن معبودوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۔۔۔۔۔۔ (۳۸/۷) جو کچھ کہتا ہے

نبی اکرمؐ

ہم نے اپنے پچھلے مسلک و مذہب میں ایسا کہیں نہیں سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی إِنْ هٰذَآ إِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ (۳۸/۷) یہ محض بناوٹ ہے اس کا خود ساختہ دعوےٰ ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آ رہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوحؑ ہوں یا ہودؑ۔ حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ۔ حضرت موسیٰؑ ہوں یا نبی آخر الزماںؐ۔ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ إِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى أُمَّةٍ

وَاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ ۰ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے؛ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ ط .... (۴۳/۲۴) ان کے رسول ان سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح۔ صحیح۔ روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو۔ تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؛ وہ کہتے کہ ہمارے لئے تقابل اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۰ (۴۳/۲۳) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہیں کے نقوشِ پا پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ اندھے کی لکڑی سب سے زیادہ محفوظ اور عافیت رساں ہوتی ہے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ۰ (۵/۱۰۴) اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم پھر انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؛ جواب ملتا کہ بے شک۔ ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ..... (۵/۱۰۴) ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ شاہراہِ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل و متواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے۔ ہر پچھلا اندھا اپنے اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہ نما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے برسرِ حق ہونے کی دلیل و حجت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود، اس قسم کی اندھی روش کو کیوں پسند کرتے ہیں؛ قرآن نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ .....

مترفین کا مسلک

وَکَذٰلِکَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ ۰ (۴۳/۲۳) اسی طرح ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ مُتْرَفِیْنَ کے معنی ہیں، وہ لوگ جو خود کچھ کام نہ کرنا چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ سہل انگار۔ محنت سے جی چرانے والے۔ اس میں دونوں باتیں آگئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان کے ذہن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ سوچ سمجھ کر راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو بڑی ذہنی کاوش اور فکری جدّوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے برعکس اسلاف کی پامال راہوں اور آباؤ اجداد سے وراثتاً منتقل ہو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کوئی سوال سامنے آئے اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس باب میں فلاں حضرت نے یہ کہا ہے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ہے

اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی قسم کی فکری کاوش درکار ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ حوالے یاد ہوں۔ یعنی جو سب سے بڑا (CATALOGUER) ہو وہ سب سے بڑا عالم ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف حافظہ (MEMORY) کی ضرورت ہوتی ہے فکر (INTELLECT) کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے، روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے۔ عوام جس راستے پر چل رہے ہوں' آپ اس کی تائید کرتے جائیے پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رہے ہو اور ان کی "بکری" پر اس قدر متعجب ہوتے ہو تو ان کی تجارت کا راز........ (TRADE SECRET) ہی یہ ہے کہ عوام کو مطمئن اور خوش رکھا جائے اور عوام کو خوش رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہو وہ راستہ جنت میں لے جانے کا ہے۔

تجارت کا راز

تجارت کا دوسرا راز یہ ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں کتنی ہی سر پھٹول کیوں نہ کریں، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے، سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنا لیں۔ یعنی ان کی باہمد گر پیوستگی کا موجب صرف اس پیشہ کا مفاد ہوگا۔ یہ جو تم مختلف پیشوں .... (PROFESSIONS) والوں کی (UNIONS) دیکھتے ہو تو ان کی وجہ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور بس۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہمد گر مربوط رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیمؑ نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا جب انہوں نے بت خانہ کے منتریوں (مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے اُن کا مذہبی جتھہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس جتھہ میں کمزوری آجائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی بسر ہو رہی ہے، وہ باقی نہیں رہے گی۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ..... (۲۹/۲۵) ابراہیمؑ نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی رُو سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے۔ اس سے تمہارا جتھہ بنا ہوا ہے اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں۔

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس

عوام کو بھڑکا کر

ہوا، انہوں نے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا! یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اٹھو! قَالُوا اقْتُلُوْهُ ..... (۲۹/۲۴) اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوْهُ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْٓا اٰلِـهَتَكُمْ..... (۲۱/۶۸) اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون

نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ...... (۲۰/۴۷) تم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز آ جاؤ اور انہیں ہمارے ساتھ جانے دو تاکہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کے کہ فرعون اس موضوع پر بات کرتا اس نے بات کا رخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کو خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔

فرعون کے دربار میں اس کے امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اور ان کے آباؤ اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ بنی اسرائیل کی بات تو بعد میں ہوگی پہلے یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ...... (۲۰/۵۱) جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں (یعنی ان امراء و وزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیشِ نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے مدِمقابل کون ہے! اس کے مدِمقابل تھا خدا کا رسولؑ جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ...... (۲۰/۵۲) ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافاتِ عمل کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے نہ غلطی کرتا ہے۔ اُن کا معاملہ اس کے سامنے ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں؟

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اقتلوہ وحرقوہ۔ پکڑ لو۔ جانے نہ دو۔ یہ فتنہ ہے۔

دورِ حاضر میں

اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے بصری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش بغیر محنت کئے حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اس سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور پر سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا اثر بہت دُور رس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے تو اس کے بعد وہ عضو ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، گول ڈاک خانہ کے پاس ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا۔ اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ دن بھر وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب کوئی قوم اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں

میں ارباب عقل و فکر کا اس قدر قحط کیوں ہے۔ ان کے ہاں صاحبانِ عقل و بصیرت کیوں پیدا نہیں ہوتے جبکہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے اٹل قانون کے مطابق ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ اس گول ڈاک خانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔

تقلید کا طوق

تقلید کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِىْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِىَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶/۸) ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے سر اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن ٹھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا — وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۳۶/۹) اُن کے سامنے بھی روک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۶/۱۰) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے۔ یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (۳۷/۶۸) ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی اس لئے کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ..... (۳۷/۶۹) انہوں نے جس گمراہ کن روش کو اپنے باپ دادا کو پایا اسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں اس لئے ان کے نزدیک ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔ ان سے جب سنیئے یہ اپنے ماضی کے نغمے دہراتے رہیں گے اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماضی کو ست جگ (حق و صداقت کا زمانہ) اور مستقبل کو کال جگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔ تمہیں یاد ہے شملہ میں وہ لڑکا ''فتو گوجر'' جب تمہیں راستہ دکھانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا تو تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔ لالٹین کے پیچھے رکھنے سے، طے کردہ راستہ تو روشن ہو جاتا تھا لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک تر ہو جاتا تھا۔ یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک گذرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک۔ یعنی ان کے اسلاف کا زمانہ، دیدۂ بینا رکھنے والوں کا زمانہ نہیں۔ درخشندہ تو انہیں کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے اُلٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آنکھیں سامنے کی طرف ہونے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ ..... (۳۳/۶۶) اس کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کی تصریح اگلی آیت میں کر دی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ...... (۳۳/۶۷) بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے جو خدا نے متعین کی تھی، ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں یوں گمراہ

کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

حیوانی سطح کی زندگی

"بھیڑ چال" کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ بھیڑوں کا ریوڑ ہوتی ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ...... انسان شہری ہوں یا دیہاتی۔ ان کی اکثریت جہنم ہی کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ...... ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ...... ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ...... ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ...... یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹) یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل و فکر سے کام لیا جائے۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ بھیڑ چال انسانیت کا خاصہ نہیں حیوانی روش ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ...... (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مذہب کا اتباع کرتے رہیں گے۔

قرآن کی نہیں، اسلاف کی اتباع

مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ...... جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ خواہ تمہارے آباؤ اجداد کچھ بھی عقل و شعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں، تم اس پر بھی ان ہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ (۲/۱۷۰) اس کے بعد ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ...... یہ لوگ جو سیدھے راستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، ان کی مثال یوں سمجھو کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں، بلا الفاظ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں، بلا معنی و مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دہراتا ہے اور بھیڑ بکریاں ان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے اِدھر اُدھر مڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباد کی تقلید کرنے والوں کی ہے۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲/۱۷۱) بہرے۔ گونگے۔ اندھے۔ عقل و خرد سے کام نہ لینے والے جانور۔ انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم! کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ...... جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مذہب و مسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے

آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں یعنی قرآن، مَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کے اتباع اور مَآ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ... (اسلاف کے مسلک) کے اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ چیز جس طرح نزول قرآن کے زمانے میں حقیقت تھی اسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں اُلجھے رہتے ہیں لیکن جونہی کوئی شخص انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اسے "دین" کے لئے عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ مختلف فرقے ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں، ان میں سے کوئی بھی مَآ اَلۡفَیۡنَا اٰبَآءَنَا کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے بھی قابلِ برداشت نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کی ذہنیت

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب ان کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ آیت یہ یہودیوں کے متعلق ہے۔ وہ عیسائیوں کے متعلق۔ فلاں آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ فلاں منافقین مدینہ کے متعلق۔ گویا یہ تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں۔ ہمارا اُن سے (اور ان کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں! یہی کچھ ہم اُن آیات کے متعلق کہہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے منع فرمایا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کے متعلق ہیں۔ ہمارے متعلق نہیں۔ حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف سے متعلق قرار دیں۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے بزرگوں کی سوءِ ادبی ہوتی ہے۔ جہاں دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ہے۔ آپ سوچیئے کہ ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح ان لوگوں کے دل کو بھی تو ٹھیس لگتی ہے جن کے متعلق آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آیات آئی ہیں۔ (یعنی غیر مسلموں کے متعلق)؟ اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ٹھیس کی ذرا بھی پروا نہ کرنا یہ تو کچھ اچھی ذہنیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلے میں "اپنے اور پرائے" میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت "اپنا یا پرایا" اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ___ ان کا انجام یہ ہوگا اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ہر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ہے کہ وہ اسی اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے بُرا منا لیتا ہے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ہے تو وہ بُرا منایا کرے۔

قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کچھ نہیں۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ہے تو تم اسے چھوڑ دو اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اسلاف میں سے فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ..... یہ (تمہارے اسلاف) گزر چکے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ...... جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (۲/۱۴۱) تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا۔ انہوں نے کیا کیا تھا؛ اس لئے اس میں تمہارے بُرا ماننے کی کیا بات ہے؛

لیکن اسلاف پرستی کا بُرا ہو کہ وہ انسان کو صداقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتی!

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کر لو کہ ان کی ہر بات غلط تھی وہ کہتا صرف یہ ہے کہ اُن کی باتوں کو (یا جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، انہیں) قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح سمجھو، جو اس کے مطابق نہ ہوں، انہیں غلط سمجھو۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ...... (۲/۱۲۰) ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ

قرآن کا فائدہ؟

ان کے سامنے بھی تو قرآن تھا اور وہ ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے) لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہیئے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ اس دلیل کو تسلیم! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری رہ گئے، نہ کہ قرآن۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں اور قرآن نہ ہو تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے۔ عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ زبان ان کی اپنی ہوتی ہے۔ مطالب و معانی سب وہی ہوتے ہیں جو اسلاف نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہو تو اس کی اس کوشش کو مردود، اور اُسے دین کے لئے فتنہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو حرفاً حرفاً اسلاف کے مسلک کے مطابق ہو۔

تدبر و تفکر

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبر و فکر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے اس کے بعد یہ منسوخ سمجھا جائے۔ لہٰذا تدبر فی القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے اسلاف کے لئے تھا۔ لیکن ان حضرات کے تصور کے مطابق ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے۔ تدبر جو کچھ کیا جانا تھا اسلاف نے کر لیا۔ لیکن یاد رکھو! نہ تو ہم خدا کے ہاں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم نے فلاں مسلک کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے اسلاف کا مسلک تھا اور نہ ہی ہمارے اسلاف ہماری اس روش کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے۔ بلکہ وہ ہم سے بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ...... (۲/۱۶۶) جب وہ لوگ جنہیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنا لیا تھا، اپنے متبعین سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور یہ متبعین عذابِ خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلیدِ اسلاف) وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے نظر آئیں گے تو اس وقت انہیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار کہیں پیچھے مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کریں جس طرح انہوں نے ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ (۲/۱۶۷) لیکن انہیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ زندگی "آواگون" کے چکر (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہورِ نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا کہ ہمارے اعمال واپس کر دئے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر لیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہوگی۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے ہو۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ

اسلاف بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے

اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ و دانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں تاکہ اس سے ان کی "دکانداری" بڑھے تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اس منظر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کر رہے ہوں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورۂ ابراہیم میں ہے کہ فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ...... یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اتباع کیا کرتے تھے تو کیا تم اس عذابِ خداوندی کو جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے، ہم سے دور نہیں کر و گے؟ اس کے جواب میں وہ پیشوایانِ مذہب اور رہ دیانِ سیاست، ان سے کہیں گے کہ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ...... اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو ہم تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے، اس وقت تو

جہنّم میں مکالمہ

جس طرح بے بس اور لاچار تم ہو ہم بھی ویسے ہی ہیں: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَجَزِعْنَآ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٍ ۝ (۱۴/۲۱) اب چیخنے چلّانے سے کیا حاصل ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس لئے اب اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

سورۂ سبا میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَآ أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ۝ (۳۴/۳۱) یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا۔ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوٓا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَآءَكُم بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ۝ (۳۴/۳۲) وہ پیشوا اور سردار، ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں موردِ الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ کیا ہم نے تمہیں اس کے اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ تم نے خود ہی اس کے اتباع کے بجائے ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا دیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَآ أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُۥٓ أَندَادًا ...... (۳۴/۳۳) یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے کہ جن سے ہم قانونِ خداوندی سے انکار کر کے تمہیں خدا کا ہمسر بنا لیں۔ ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے تمہارا اتباع اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اس کے لئے جو طریق تم نے اختیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

سلیم! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے بتیانِ حقیقت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے کہ رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ...... اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَآ ءَاتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۳۳/۶۸) اے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے۔ ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دور رکھ۔ بہت دور۔

سورۂ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعد میں آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہے گی کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اس لئے انہیں دگنا عذاب ملنا چاہیئے۔ اس کا انہیں جواب ملے گا کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملے گا۔ پہلی نسل

کو اس لئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنے والوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے اور تمہیں اس لئے دگنا عذاب دیا جائے گا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے بُری مثال قائم کر گئے۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنے والوں کے اسلاف تھے۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ (۷/۳۹) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دُہرا عذاب اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو؟ ہم غلط روش پر چلے تھے تو تم نے کونسا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا؟ اس لئے تم اپنے کئے کا پھل پاؤ۔ ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ جو قومیں اپنی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں۔ ان پر غلط روی

تقلید کا چکر

کا ایک ایسا چکر محیط ہو جاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔ ہر نسل اپنے پیشروؤں کے نقوشِ قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے۔ اور اپنے نقوشِ قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تاکہ وہ بھی ان کی طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں۔ دو چار نسلوں کے بعد یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے؟ اقوامِ سابقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجاتا تھا جو انہیں اس چکر - - - - - - - - سے نکال کر سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ نئے نبی کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سابقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حضورؐ کی اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی

نجات کا راستہ

شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس لئے انہیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں خدا کی کتاب اس کے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے۔ اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہو جاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہیئے تاکہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی آنے والوں کے لئے سند میں اضافہ کر دیتی ہے۔ تم نے .... (STEEL WORKS) کے کارخانے میں دیکھا تھا جب انجن کو شروع میں (START) کرتے تھے تو اس کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا (FLY WHEEL) خود اپنے زور سے (MOMENTUM) سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر، آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا۔ یہی کیفیت

قوموں کی نفسیات کی ہے۔ شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں، گذشتہ نسل کی روش، آنے والی نسل کے لئے [illegible] کا کام دیتی ہے۔ اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کسی قدر بڑے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔

اگر اس کام کو کسی قوم نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی ذور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے) کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس طبقہ

سخت مخالفت

میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی موجودہ روش کو، جسے انہوں نے اسلاف کے اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے، دیانتداری سے صحیح روش سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہٹنا اُن کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جہنم کی طرف چلے جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں ——— اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت (POPULARITY) حاصل ہوتی ہے اور دکانداری کو فروغ۔ اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے۔ وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرتے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔

لہٰذا اس آواز کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیتِ عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوہشوں کے علی الرغم، آنکھیں بند کر کے چلنے والوں سے حضور رسالت مآبؐ کے اتباع میں للکار کر کہیں کہ

اِنَّمَآ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا ...... (۳۴/۴۶)

"میں تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے دو دو۔ ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو!"[1]

اگر اس انبوہِ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھو کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اس لئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے کسی پکارنے والے کی آواز پر رُک جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے تیار ہے۔ (یا اُسے کم از کم اپنی موجودہ روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رُکتا ہی کیوں) اور اس کے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آجائے۔ اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کونسا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی اکرمؐ گامزن تھے۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے　　ز بندِ پاستاں آزاد رفتے!
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے
(اقبالؒ)

(جون ۱۹۵۰ء)　　والسلام　　پرویز

[1] اس موضوع پر "سوچا کرو" کے عنوان سے طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء میں ایک سیر حاصل مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

مطالب الفرقان ۔ جلد چہارم ۔ شائع ہو گئی

للہ الحمد کہ، حالات کی اس قدر نامساعدت کے باوجود، مطالب الفرقان کی چوتھی جلد بھی شائع ہو گئی ہے ۔ اس کی پہلی تین جلدیں صرف سورۂ بقرہ کو محیط تھیں ۔ یہ جلد سورۂ آل عمران ۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ پر مشتمل ہے ۔ اس سے پہلے سب سے ضخیم تیسری جلد تھی جس کی ضخامت قریب ساڑھے پانچ سو صفحات تھی ۔ چوتھی جلد قریب ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ حجم کی زیادتی کی وجہ سے پہلے خیال تھا کہ سورۃ المائدہ کو اس میں سے حذف کر دیا جائے لیکن قارئین کے بے پناہ اشتیاق کے پیش نظر مناسب نہ سمجھا گیا کہ انہیں مزید عرصہ کے لئے اس کے انتظار میں رکھا جائے ۔ اس جلد کے نمایاں موضوعات یوں سامنے آتے ہیں ۔

- آیاتِ محکمت و متشابہات ۔
- حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ کے احوال و کوائف ۔
- حضرت مریمؑ کی انقلاب انگیز زندگی ۔
- حضرت عیسےٰؑ کی داستانِ حیات ۔
- بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ ۔
- مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کے خلاف سرکشی ۔
- رومن شاہنشاہیت کے خلاف بغاوت ۔
- واقعہ صلیب کی تفصیلی سرگزشت ۔
- معجزات کی حقیقت ۔
- وفات و نزولِ مسیح کی بحث ۔
- تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں بصیرت افروز انکشافات ۔
- اسلامی نظام ۔
- سنّت اور حدیث کی صحیح پوزیشن ۔
- اطاعتِ خدا و رسول کا قرآنی مفہوم ۔
- ترکہ اور وراثت کے احکام اور تقسیم ۔
- یتیم پوتے کی وراثت ۔
- حدود (جرائم کی قرآنی سزائیں) ۔
- قطعِ ید وغیرہ ۔

ان چند ایک عنوانات سے کتاب کے مندرجات کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے ۔ اسے ادارہ طلوعِ اسلام کے اشاعتی معیار کے مطابق، دلکش اور پائیدار انداز سے طبع کیا گیا ہے ۔ عام کتابوں کے مقابلہ میں ضخامت کے قریب دُگنا ہو جانے کی وجہ سے قیمت ۔/۹۰ روپے (ڈاک خرچ ۔/۸ روپے) مقرر کی گئی ہے ۔

ملنے کے پتے :

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش ۔ چوک اُردو بازار لاہور

نمائندہ روزنامہ جنگ کا

پرویز صاحب سے انٹرویو

۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء کی شام روزنامہ جنگ (لاہور) کے نمائندہ، محترم نذیر ناجی صاحب، اپنے دو رفقاء کے ہمراہ، پرویز صاحب کا انٹرویو لینے کے لئے، ان کی اقامت گاہ (۲۵ - بی/گلبرگ ۲) پر تشریف لائے۔ انٹرویو قریب دو گھنٹے تک جاری رہا— بعد ازاں اس کی روئیداد، روزنامہ موصوف کی خصوصی اشاعت بابت ۸ تا ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اسے (بعض لفظی تسامح کی تصحیح کے بعد) اس بنا پر طلوعِ اسلام میں شائع کیا جاتا ہے کہ

(۱) اخبارات میں شائع شدہ مقالات کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے، اور اس انٹرویو کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے تاکہ، نہ صرف طلوعِ اسلام کے حالیہ قارئین بلکہ آنے والے اربابِ فکر و تدبر بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور

(۲) اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ آج کل اربابِ دانش کے دل میں کس کس قسم کے سوالات اُبھرتے ہیں اور وہ ان کا حل دریافت کرنے کے لئے کس قدر متجسس ہیں۔

———— (٭) ————

انٹرویو:-

جنابِ غلام احمد پرویز قائدِ اعظم کے رفقاء میں سے ہیں۔ ایک جیّد عالمِ دین اور قرآن مجید کے جانے پہچانے سکالر۔ برصغیر میں ان کی فکر سے مستفیض ہونے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ان کے فلسفہ و فکر کا ماخذ بنیادی طور پر قرآن کریم ہے۔ زیرِ نظر گفتگو کو ان کے اسی طرزِ فکر کی روشنی میں پڑھنا چاہیئے۔ اس مرتبہ میرے ساتھ لاہور ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ جنابِ فاروق بیدار اور تجربہ کار صحافی جنابِ الطاف احمد قریشی تھے۔ گفتگو کا آغاز جنابِ غلام احمد پرویز کے ساتھ کیا۔

پرویز:- میں عموماً انٹرویو دینے سے احتراز کرتا ہوں۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ احباب کی ایک محفل ہے، جس میں کھل کر

بے تکلفانہ گفتگو کریں گے، اخباری اصطلاح میں آپ اسے انٹرویو کہہ لیجئے یا جو جی میں آئے ہمارے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

مناجی:- سب سے پہلے تو میں اظہارِ ممنونیت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت نکال کر ہم لوگوں کو شرفِ باریابی دیا، اپنے ساتھی احباب کا میں تعارف کرا ہی چکا ہوں، ہم ایک ترتیب سے یا باری باری کہہ لیں، چند سوالات کریں گے، تو پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں ایک جدید اسلامی ریاست کا کیا خاکہ ابھرتا ہے؟

جدید اسلامی ریاست

پرویز:- اسلامی ریاست نہ جدید ہوتی ہے نہ قدیم۔ اسلامی ریاست قرآن کریم کے اصول و اقدار و احکام کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، یہ اصول و اقدار قدیم و جدید میں تقسیم نہیں کئے جا سکتے، وہ غیر متبدل ہیں، مکمل ہیں۔ قرآنِ کریم نے بجز چند احکام ...... اصول و اقدار کی حدود متعین کر دی ہیں، اس نے یہ کہا ہے کہ اسلامی مملکت وہ ہے جو قرآن کے مطابق قائم ہو اور اس کا فریضہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے .... اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین نافذ کرنے کے طریقے اُمّت کے مشورے سے خود وضع کرے۔ تو گویا اصول و اقدار غیر متبدّل چلے آ رہے ہیں، اس اعتبار سے انہیں جدید نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہم اپنے زمانے میں یعنی اسلامی مملکت میں اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، ان اصول کی حدود میں رہتے ہوئے، اُمّت کے مشورے سے جو قوانین وضع کر کے نافذ کریں گے وہ جدید ہوں گے۔ انہیں بائی لاز کہہ لیجئے۔ احکام کہہ لیجئے۔ اس مملکت کا طریقِ کار کہہ لیجئے۔ یہ تو ہوگا جدید اور وہ ہوگا قدیم۔

اسلامی ریاست کی ہیئت کذائی

مناجی:- جب میں نے جدید ریاست کی اصطلاح استعمال کی تھی تو مقصود یہ تھا کہ اسے دیگر ادوار سے متمیز کر سکوں۔ مثلاً ایک قدیم قبائلی ریاست تھی، بادشاہی ریاست تھی، اس کے اپنے انتظامی ڈھانچے تھے، جدید ریاست میں بنیادی حیثیت اداروں کو حاصل ہے، عہدِ جدید کو ایک طرح سے آپ انسٹیٹیوشنلائزیشن کا عہد قرار دے سکتے ہیں، مثلاً عدلیہ کا ادارہ، معیشت کے ادارے جیسے بینک اور انشورنش کمپنیاں، تجارت کے ادارے، عرض یہ کر رہا تھا کہ جدید ریاست جو نہایت منظم اداروں کے مجموعے کا نام ہے، اس میں ہم ان اداروں کی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے کس طرح کریں؟ اس سلسلے میں ایک ملتا جلتا سوال یہ ہے کہ ہم اسلامی ریاست کی ہیئت کی جو بات کر رہے ہیں اس کے تفصیلی اجزا کی تلاش تو قرآنِ حکیم میں ہو نہیں سکتی۔ سوال یوں ہے کہ قرآن میں دیئے گئے بنیادی اصولوں کا موجودہ معاشرے پر اطلاق کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

پرویز:- میں پہلے عرض کر دوں کہ میں قرآنِ حکیم کا طالب علم ہوں، جو جواب دوں گا قرآن کی حدود کے اندر رہ کر دوں گا۔

جو چیز قرآن میں نہیں ہوگی اس کے بارے میں عرض کروں گا کہ قرآن نے اس کی تفصیل نہیں دی۔ تو میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مملکت کا تصور، قرآن کی رُو سے ایک ایسا ادارہ ہے جو قرآن کے اصول و اقدار کو اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق روبہ عمل لائے۔ یہ جتنی چیزیں آپ نے فرمائیں ہیں کہ اس دور میں انہیں کیسے انسٹیٹیوشنلائز کیا جائے؟ تو یہ اسلامی ریاست کے کرنے کے کام ہیں۔ میرے نہیں، وہ اگر مشورہ طلب کرے تو میں دوں گا، لیکن یہ میرے، زید یا بکر کے کرنے کا کام ہے نہیں۔ اسلامی ریاست یا مملکت خود دیکھے گی کہ اس کے اندر اداروں کو کس طرح منظم کرنا ہے۔ یہ بات وہ طے کرے گی، کوئی ایک فرد نہیں۔ یہی چیز میں قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے عرض کروں گا کہ ایک فرد کو یہ طے کرنے کا حق نہیں ہے کہ کیا چیز اسلامی ہے، کیا نہیں ہے؟

الطاف:۔ بجا فرمایا آپ نے، آپ کا ارشاد ہے کہ یہ اسلامی ریاست یا مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں سوچے، ہم جب آپ سے بات کرتے ہیں تو اس کا ایک حوالہ بنتا ہے، قرآن کو جاننے والے کی حیثیت سے۔ اس حوالے سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس اسلامی ریاست کی آپ بات کرتے ہیں، اس میں اداروں کی تشکیل کس طرح ہو سکتی ہے؟ ریاست کا ڈھانچہ، آپ کے ذہن میں کس طرح اُبھرتا ہے؟

ناجی:۔ اس سوال میں ذرا سا اضافہ۔ آپ نے فرمایا کہ سب کام تو مملکت کے کرنے کے ہیں، میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں، تو آپ سے پوچھوں گا کہ مملکت کہاں سے آئے گی؟ یا تو یہ تاریخی تسلسل میں چلی آنے والی چیز ہوتی ہے یا اسے قائم کیا جاتا ہے۔ میں پاکستان کی بات کروں گا۔ کیا ہم اس لئے اسے اسلامی کہیں کہ یہ خلافتِ راشدہ کا تسلسل چلا آرہا ہے۔ امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسا نہیں۔ جب یہ تسلسل نہیں تو پھر کیا مسلمانوں کی موجودہ سلطنتیں موجودہ اسٹیبلشمنٹ، موجودہ انتظامیہ کے ساتھ اسلامی کہلا سکتی ہیں؟ اگر اسلامی نہیں تو پھر اس سے الگ سوال اُبھریں گے۔ وہ اسلامی ریاست جس کا ذکر آپنے کیا ہے جس کے فرائض کی نشاندہی آپ نے کی ہے۔ اس کے قائم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟

ابدی اصول اور قابلِ تغیّر تفصیلات

پرویز:۔ اسلامی مملکت کے متعلق بنیادی اصول جو قرآن نے بیان کر دیئے ہیں وہ یہ ہیں (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں) "کافر اور مومن یا اسلام اور کفر میں خطِ امتیاز یہ ہے کہ جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں وہ مومن ہوتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہوتے ہیں"۔ یہ اصول تو اسلام نے بیان کر دیا۔ اب ریاست یا حکومت کے متعلق جتنی بات کی جائے گی وہ یہ ہوگی کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ یہاں یہ نہیں ہوگا کہ کوئی کیا کہتا ہے (میں یا کوئی اور) یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ خدا کی کتاب کیا کہتی ہے۔ قرآن مملکت کا ڈھانچہ نہیں دیتا، ڈھانچہ متبدّل ہوتا ہے، بدلتا رہتا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ "میرے اصول اور اقدار مکمل بھی ہیں اور غیر متبدّل بھی"۔ لیکن اسلامی ریاست کے ڈھانچے کی جو مختلف شکلیں ہیں، یہ قرآن نے کہیں نہیں دیں (دانستہ نہیں دیں) کیونکہ یہ چیزیں بدلنے والی ہیں۔ اگر قرآن یہ چیزیں

خود دے دیتا (جو بدل سکتی ہیں) تو ہم مصیبت میں پھنس جاتے۔ اس لئے کہا ہے اگر جزئیات اور طریق کار کو بھی قرآن میں دے دیا جاتا تو وہ غیر متبدّل قرار پا جاتیں اور جب وہ زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتیں تو تم یہ کہہ کر دین ہی کو چھوڑ دیتے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے۔ جیسا کہ یہودیوں نے کیا۔ اس لئے ہم صرف اصول و اقدار دے رہے ہیں اور ان کے تابع جتنی جزئیات ہیں وہ تمہیں خود متعین کرنا ہوں گی۔ کیونکہ یہ بدلتی رہتی ہیں ...... ہاں البتہ یہ انہی اصول و اقدار کے مطابق ہونا چاہیئے جو غیر متبدّل ہیں۔ آپ نے تاریخ کی جو بات کی ہے اس سے متعلق پہلی بات تو یہی ہے کہ اگر ہمیں صحیح تاریخ مل بھی جائے تو وہ یہی بتائے گی کہ فلاں دور میں اسلامی مملکت کی تفصیلات کیا تھیں لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے تفصیلات تو ہر زمانے میں بدلتی رہیں گی۔ اگر ہمیں کسی سابقہ دور کی تفاصیل معلوم بھی ہو جائیں تو ان سے صرف تاریخی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی تفصیل ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو اسلامی مملکت اسے اختیار کرے گی۔ اگر ایسا نہیں تو وہ اپنے لئے تفاصیل آپ مرتب کرے گی۔

علاوہ ازیں ہماری تاریخ خود تاریخ کے اصولوں کی رُو سے بھی مستند تاریخ نہیں کہلا سکتی۔ یہ تاریخ صدرِ اوّل کے قریب تین سو سال بعد زبانی روایات کی رُو سے مرتب ہوئی تھی۔ اس میں اختلافات خود اس امر کے شاہد ہیں کہ اسے مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مستند اور غیر متبدّل قرآن کے اصول و اقدار ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ چلے آتے ہیں۔ اسلامی مملکت انہی اصول و اقدار کی حدود کے مطابق قائم ہوگی۔ اس لئے اسے اسلامی قرار پانے کے لئے خارج از قرآن سابقہ ادوار میں متعیّن کردہ جزئیات کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کی ضرورت تو جب ہو کہ اس کی جزئیات کو آج بھی من و عن اسی شکل میں نافذ کرنا لازمی ہو۔ صدرِ اوّل کے بعد آج تک جتنی ریاستیں بھی قائم ہوئیں وہ اسلامی نہیں تھیں کیونکہ ان میں اقتدارِ مطلق قرآن کو حاصل نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں۔ ان میں قرآن کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ تو قائم بھی قرآن کے مطابق نہیں ہوئی تھیں۔ ما انزل اللہ اور ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ تو اس مملکت کو جو بزورِ شمشیر قائم کی جائے یا موروثی بادشاہت ہو غیر اسلامی قرار دیتا ہے۔ اگر کسی غیر قرآنی ریاست میں قرآن کے کسی حکم کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے وہ ریاست اسلامی نہیں ہو جاتی۔ انڈیا والے اگر شراب کو ممنوع قرار دے دیں (جو کہ اسلام کا حکم ہے) تو اس سے بھارت کی حکومت اسلامی نہیں ہو جاتی۔ حکومت کے اسلامی ہونے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا جملہ کاروبار ما انزل اللہ کے مطابق ہو۔ سوائے اس پہلے دور کے جس کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ (تاریخ کی رُو سے نہیں) کسی دور میں کسی مملکت میں ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اگر کسی نے اسلامی حکومت قائم کرنی ہے تو اس کے لئے دیکھنا یہ ہوگا کہ قرآن کے اصول و اقدار کیا ہیں؟ ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمّت باہمی مشاورت سے اس کی تفصیلات طے کرے گی۔

ناجی: - عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ سے یہ مشورہ طلب کیا جائے اور آپ سے یہ عرض کیا جائے کہ جناب ہم اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کی رُو سے اسلامی مملکت کے خط و خال کیا ہوں

سکتے ہیں۔ اس کا ڈھانچہ کیا ہوگا۔ وہ غیر متبدل اصول کیا ہیں...... جن کے اندر رہ کر ہم اسلامی مملکت قائم کر سکتے ہیں؟

پرویز:۔ میں اس پر غور تو کرتا رہتا ہوں، لیکن اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا، کیونکہ یہ میرے اور آپ کے کہنے کی نہیں۔ اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ فائدہ تو اس وقت ہوگا جب اسلامی حکومت کے لئے پہلا اساسی قدم اٹھایا جائے یعنی یہ فیصلہ کہ ریاست کا کاروبار قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمّت کے مشورہ سے ہوگا۔

الطاف:۔ آپ کے خیال میں وہ اساسی حالات کیا ہوں گے؟

پرویز:۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں ان چیزوں کے متعلق کچھ نہیں کہا کرتا۔ یہ قبل از وقت ہیں۔ جہاں اسلامی مملکت قائم ہوگی وہاں کے ارباب فکر اس کے متعلق سوچیں گے۔

الطاف:۔ آپ کی اس گفتگو سے یہ احساس ہوا بلکہ یہ تاثر ملا ہے جیسے آپ کسی یوٹوپیائی بات کر رہے ہیں۔ کہ جب ایسا ہوگا تو ایسے ہوگا اور پتہ نہیں کب ہوگا، احساس یہ ہوا ہے کہ یہ کوئی تصوراتی قسم کی بات ہے کہ شاید ایسا ہو جائے ورنہ اس کے مثبت امکانات نہیں ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب پاکستان قائم ہوا تو ایک خطے کے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے جو خطہ چنا گیا اس کے اردگرد جو سرحدیں قائم ہوئیں اس کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ اسے برِصغیر کے مسلمانوں کی مملکت اور ریاست کہا گیا۔ ظاہر ہے اس وقت اس حوالے سے ایک خطۂ زمین تو مسلمانوں کے پاس ہے، لہٰذا لوگوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ اس میں اسلامی ریاست کے خط و خال کیا ہو سکتے ہیں۔ آپ ان کی کیا تصویر لوگوں کو پیش کریں گے؟

اسلامی ریاست یوٹوپیا نہیں

پرویز:۔ معاف رکھئے! یا تو میں اپنا مفہوم واضح نہیں کر سکا۔ یا آپ سمجھے نہیں۔ اسلامی مملکت کا قیام یوٹوپیا نہیں۔ یہ ہر دور میں ہر وقت ممکن العمل ہے لیکن آج ہم جس دور میں رہ رہے ہیں اس میں مسلمانوں کی کوئی مملکت ایسی نہیں جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اپنا تمام کاروبار ما انزل اللہ کے مطابق کرے گی۔ اور وہ ایسا کر رہی ہو۔ ظاہر ہے اس صورت میں یہ سوچنا اور ورک آؤٹ کرنا کہ اس اسلامی ریاست کی شکل کیا ہوگی، انتخابات کیسے ہوں گے؟ مشاورت کیسے ہوگی۔ پارلیمنٹ بھی ہوگی یا نہیں آئین اس قسم کا ہوگا، یہ سب کچھ قبل از وقت ہوگا۔ اور مفید مطلب بھی نہیں کہ یہ جزئیات اس وقت کے حالات کے مطابق طے ہوں گی۔ میری عمر اسی میں گذر رہی ہے۔ یہی چیز تھی جو میں نے علامہ اقبالؒ سے سیکھی۔ میری فکر قرآنی انہی کے فیضان کی رہینِ منت ہے۔ یہی چیز تھی جو تحریک پاکستان کے دوران مجھے قائداعظمؒ کے گوش گذار کرنے کا موقع ملا اور ان سے ملاقاتوں میں یہ اصول ہی تھے جن پر ہم بحث کرتے تھے۔ اگرچہ قائدِاعظمؒ کی نظر میں تھا کہ یہیں ایک خطۂ زمین مل رہا ہے اور وہاں ہمیں یہ کام کرنے

ہیں۔ انہوں نے بھی (جہاں تک میرے علم میں ہے) کسی آئین کا خاکہ یا جزئیات کا نقشہ نہیں بتایا تھا، جب بھی بات ہوتی وہ یہی پوچھتے کہ بتاؤ اس مملکت کے اصول کیا ہوں گے۔ وہاں اگر اصول کے متعلق آپ پوچھتے ہیں تو اس میں بنیادی بات جو قرآن کہتا ہے وہ یہ ہے کہ" اس مملکت میں ہر انسان کی بحیثیت انسان تکریم ہوگی"۔ اس مملکت کا کوئی فیصلہ خواہ وہ اشارۃً یا کنایۃً ہی کیوں نہ ہو، اگر ایسا ہے کہ اس سے کسی انسان کی تذلیل ہوتی ہے وہ ما انزل اللہ کے خلاف ہوگا۔ اب یہ کہ اس مقصد کے لیئے کس قسم کے قانون بنائے جائیں گے یہ میرے بتانے کی بات نہیں۔ میرے بتانے کی بات تو یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کی تذلیل نہ ہو۔ اور یہ اتنا بڑا اصول ہے کہ اگر آپ اس کی جزئیات میں جائیں تو معلوم نہیں کیا کچھ سوچنا اور کرنا پڑے۔ اس میں تو مجرم اور انسان میں بھی فرق نہیں کیا جائے گا۔

اِسلامی ریاست کے کچھ بنیادی اصُول

اسلامی مملکت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد بھی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اگر کسی بستی میں ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھ جائے گی اور وہ بستی اسلامی نہیں رہے گی۔ یہ وہ اصول ہیں جن پر اسلامی ریاست عملی طور پر کام کرے گی۔ ممکن ہے اس شعبے میں مَیں مشورہ نہ دے سکوں، کوئی ماہرِ اقتصادیات مشورہ دے سکے۔ تاہم اصول یہ ہوگا کہ کوئی فرد رات کو بھوکا نہ سوئے۔ کوئی فرد تن ڈھانپے بغیر نہ رہے، کوئی فرد رزق سے محروم نہ رہے۔ یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے جو اس مملکت کو پورا کرنا ہے۔ اس ذمہ داری سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہے یہ اس مملکت کے کرنے اور سوچنے کا کام ہوگا۔ اس وقت حالات کیا ہوں گے۔ کون لوگ مشورہ دیں گے۔ یہ الگ بات ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی ساری عمر یہی اصول بیان فرمائے اور قائدِ اعظمؒ نے بھی۔ آپ دیکھتے ہیں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اصول ہی تھے۔ کہیں انہوں نے جزئیات کی تشکیل کا ذکر نہیں کیا۔ میں تو ہندوستان میں بھی اور یہاں بھی تیس پینتیس سال سے اصول ہی بیان کر رہا ہوں کہ اس میں یہ یہ

ح۱ قائدِ اعظمؒ اس باب میں کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ (تحریکِ پاکستان کے دوران تو ایک طرف) تشکیلِ پاکستان کے بعد، انہوں نے بہ حیثیت گورنر جنرل فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان کا کانسٹی ٹیوشن کیا ہوگا، کہا تھا کہ

> پاکستان کا کانسٹی ٹیوشن، پاکستان کی مجلسِ دستور ساز نے ہنوز مرتب کرنا ہے! میں نہیں کہہ سکتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا حامل جمہوری آئین ہوگا۔ یہ اصول عملی زندگی میں آج بھی اسی طرح ممکن العمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے...... اتنی بات واضح ہے کہ پاکستان ایسی مملکت نہیں ہوگی جہاں تھیا کریسی عمل پیرا ہو۔

آپ غور کیجئے کہ قائدِ اعظمؒ ــــــ قوم کے مسلّم راہ نما۔ پاکستان کے گورنر جنرل اور اعلیٰ پایہ کے مقنّن ہونے کی جہت سے ــــــ اس پوزیشن میں تھے کہ دستورِ پاکستان کی کچھ تفصیلات بیان کر دیتے۔ لیکن (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

خصوصیات ہوں گی تو اسے اسلامی ریاست کہا جائے گا۔ یہ کس طرح سے ہوگا۔ یہ بات مملکت کے طے کرنے کی ہے اور اس وقت قبل از وقت۔ کیونکہ اس وقت اس کے بیسیوں شعبے ہوں گے ہر شعبے میں تو میں مشورہ نہیں دے سکوں گا جو اس کے اہل ہوں گے وہی مشورہ دیں گے۔ اس میں قرآن کی رو سے مرد اور عورت کی مساوات ہوگی۔ اس حوالے سے بھی یہ چیز ان کے طے کرنے کی ہوگی۔ وہاں تسخیرِ کائنات کا اصول ہے کائنات کو مسخر کرکے اس کی قوتوں کو قرآن کی اقدار کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال میں لانے کی شرط ہوگی۔ قرآن کی رُو سے بقا اسی کام کے لئے ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کیا جائے۔ اگر اس اصول کا دائرہ وسیع کر دیا جائے تو اس کے اندر پوری انسانیت آجاتی ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسلامی مملکت کے قیام کا ارادہ کرے تو یہ بات مدِنظر رکھے کہ یہ اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ اسے جہاں سے بھی شروع کرنا ہے وہ قدم اوّل اٹھا سکتا ہے اس کے بعد بتدریج اس کی تکمیل ہوگی۔ یہ پہلے دن ہی نہیں ہو سکے گا۔

مشاورت کے لئے کس قسم کے لوگ ہوں گے

الطاف:۔ جہاں تک مشورے کا تعلق ہے کیا اس کے لئے کوئی ایسی چیز ہے جس سے ہم سمجھ سکیں کہ مشورے کے لئے کس قسم کے آدمی کو قابلِ اعتبار سمجھا جائے، کس قسم کے آدمی سے مشورہ کیا جائے۔ یا اس طرح کہ جیسے یونان میں ہوتا تھا کہ ایک پورا شہر یا ملک اکٹھا ہو کر فیصلہ دیا کرتا تھا۔ آپ کے خیال میں مشورے کے لئے کس قسم کے لوگوں کا ہونا ضروری ہے؟

فاروق:۔ مزید ا...... آپ کی نظروں سے گذرا ہوگا کہ ان دنوں مجلسِ مشاورت کے بڑے چرچے ہیں جو ہمارے یہاں بن رہا ہے۔ اگر موجودہ صورت میں شوریٰ قائم کر دی گئی تو اس کے مشوروں کی قانونی (خصوصاً اسلامی حوالے سے) کیا حیثیت ہوگی؟

پرویز:۔ میرے نقطۂ نگاہ سے وہ ہمارے ملک کے قوانین ہوں گے۔

ناجی:۔ اس میں مجلسِ مشاورت کی حیثیت کیا ہوگی؟

پرویز:۔ یہ تو نام رکھنے کی بات ہے۔ پہلے اس کا نام پارلیمنٹ تھا، اب مجلسِ مشاورت رکھ لیں۔ صرف نام رکھنے سے تو مجلسِ مشاورت اسلامی نہیں ہو جاتی۔ اسلامی مملکت کی مجلسِ مشاورت ہی اسلامی ہوگی۔ ہمارے ہاں مصیبت

(بقیہ حاشیہ) انہوں نے اس سے عمداً اجتناب برتا اور یہ کہہ کر کہ یہ تفصیلات مجلس دستور ساز کے طے کرنے کی ہیں یہ واضح کر دیا کہ جو فریضہ پوری قوم کا ہو، کسی فرد کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس باب میں لب کشائی کرے۔ ایسا کرنا غیر ذمہ دارانہ بھی ہوتا ہے اور قبل از وقت بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم عمل سے بیگانہ ہو چکی ہو، وہ اس قسم کی لاحاصل نظری بحثوں میں بڑی لذت لیتی ہے۔ اس سے، سوائے اس کے کہ قوم میں اختلافات پیدا ہوں اور انتشار بڑھے، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے۔ اسلام کا مفہوم تک متعین نہیں، اور اسلامی مملکت کی جزئیات متشکل کرنے کی بحثیں جاری ہیں۔ اسے کہتے ہیں "پانی بلونا"۔

(طلوعِ اسلام)

یہ ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر کسی چیز کو اسلامی کہہ دے ایسا کہنے کے لئے اس کے پاس اتھارٹی کیا ہے؟ نہ اس کا ابھی تک تعین کیا گیا ہے نہ ہی کوئی اسے بتانے کی ضرورت سمجھتا ہے۔

ناجی:- کوئی مثال؟

اسلامی اور غیر اسلامی

پرویز:- مثلاً کل تک جو طب یونانی تھی آج وہ طب اسلامی ہے۔ ہمارے حکیم خود اسے طب یونانی کہتے تھے۔ اب اسی کو طب اسلامی کہنے لگ گئے ہیں۔ نہ کوئی پوچھتا ہے نہ بتاتا ہے کہ اس طب میں کیا تبدیلی ہوئی ہے جس سے وہ یونانی سے اسلامی ہوگئی ہے۔ ذرا اس بنیادی بات کو سمجھئے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ آئین کے خلاف ہے، یا آئین کے مطابق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بات مسلّم ہوتی ہے کہ کوئی آئین موجود ہے جس کے حوالے سے آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کے مطابق ہے یا خلاف، اس کے لئے پہلے آئین کا موجود ہونا ضروری ہے۔ پھر اس آئین کے متعلق یہ بھی ضروری ہے کہ جو دو فریق اس کی بات کرتے ہیں وہ دونوں اس پر متفق ہوں اور اسے فائنل اتھارٹی مانتے ہوں۔ اس کے بعد یہ بات آگے چلائیں کہ متنازعہ فیہ معاملہ آئین کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اسی طرح جب آپ قانون کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قوانین کا کوئی ضابطہ موجود ہے جس کی رُو سے یہ طے ہوگا کہ وہ بات قانون کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، لیکن اسلام کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ "غریب کی جورو سب کی بھابی" جس کا جی چاہے جس شئے کو چاہے اسلامی کہہ دے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کہنے کے لئے اس کی اتھارٹی کیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی کہنے کے لئے اتھارٹی کیا ہے۔ اگر یہ بات طے ہو جائے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ میں کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتا لیکن اس نکتہ کی وضاحت کے لئے مثال کے طور پر ایک واقعہ سامنے لانا چاہتا ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے لئے مختلف علماء میں اتحاد ہوا تھا۔ وہ نظامِ مصطفےٰ کیا تھا ایک اسلامی ریاست کا قیام ہی تھا نا!..... ان سب کا اس بات پر اتفاق تھا۔ یعنی یہ سب اسلامی ریاست یا نظام کے متعلق متفق تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ہمارے قریب ہی چودھری ظہور الٰہی (مرحوم) کی کوٹھی میں ایک افطار کی دعوت تھی جس میں اتحاد کے نامور لیڈر موجود تھے۔ علماء حضرات بھی تھے۔ افطار کی میز پر تو وہ سب اکٹھے بیٹھے تھے لیکن جب مغرب کی نماز کے لئے اذان ہوئی تو مفتی محمود (مرحوم) اپنے ٹولے کو لے کر ایک طرف کو ہو گئے اور مولانا نورانی صاحب دوسری طرف۔

الطاف:- جماعتِ اسلامی والے بھی ایک طرف ہو گئے ہوں گے؟

پرویز:- جی نہیں اخبار میں ان دو ہی جماعتوں کا ذکر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نظامِ مصطفےٰ میں بنیادی حیثیت نماز کو حاصل ہوگی لیکن یہ حضرات تھے کہ نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے لئے تو متحد تھے لیکن عملاً اس نظام کی بنیادی شکل میں ایک دوسرے سے الگ۔ پھر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ان میں شیعہ سنّی کا فرق نہ تھا۔ اہلِ فقہ

اور اہلِ حدیث کا بھی فرق نہیں تھا۔ یہ دونوں اہلِ فقہ تھے۔ (اگرچہ فقہ بھی چار ہیں) مگر یہ دونوں حنفی فقہ کے ماننے والے تھے۔ آپ سوچئے کہ جو حضرات یہ نہ طے کر سکیں کہ نماز کی مصطفوی شکل کیسی ہے کیا وہ نظامِ مصطفےٰ کا کوئی متفق علیہ نقشہ قائم کر سکیں گے؟

خا ذوق :۔ آپ نے ایک ایسے معاشرے کا ذکر کیا ہے جس میں انسانیت کی تذلیل نہ ہو اور انسانیت میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی نہیں ہے تو آپ ایک ایسے معاشرے کے متعلق کیا کہیں گے جس میں نماز روزہ تو ہو لیکن اس کے ساتھ انسانیت کی تذلیل بھی پورے زور شور سے موجود ہے۔ ایسے معاشرے اور حکومت سے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

نماز، روزہ اور اسلامی معاشرہ

پرویز:۔ نماز، روزہ فرائض ہیں جن کی ادائیگی اور احترام ضروری ہے۔ لیکن محض نماز روزے سے معاشرہ اسلامی نہیں ہو جاتا۔ اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ فوجی سپاہی کے لئے پریڈ ضروری ہوتی ہے اور وردی بھی۔ یہاں تک کہ وردی میں جوتے کا تسمہ باندھنے کے لئے بھی ایک قاعدہ مقرر ہوتا ہے۔ ایک سپاہی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان قواعد کا پابند رہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں جا کر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سارا دن تسمہ ہی باندھتا رہے تو وہ سپاہی نہیں بن سکتا۔ ایک واقعہ آپ کو سناؤں۔ ایک شخص حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا، انہوں نے اس سے کہا اپنا گواہ لاؤ۔ اس نے کہا کہ فلاں شخص میرا گواہ ہے۔ آپ نے پوچھا کہ اس کے متعلق تمہیں کچھ پتہ بھی ہے۔ کہا جی ہاں۔ فرمایا۔ تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کہا نہیں۔ سفر میں کبھی اس کے ساتھ گئے ہو۔ کہا نہیں۔ کبھی اس کے ساتھ کچھ کاروبار کیا ہے۔ کہا نہیں۔ کہنے لگے تو پھر تم نے اسے مسجد میں اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ وہ معتبر آدمی ہے۔ کہا جاؤ کسی معتبر آدمی کو لاؤ۔ کسی کے مسلمان (یعنی مومن) ہونے کے لئے دیکھنا یہ ہوگا کہ اس کا کردار کس قسم کا ہے۔ انسانوں کے ساتھ اس کا معاملہ کس قسم کا ہے۔ قرآن مومن کی حقیقی صفات بیان کرتا ہے۔ ان میں پہلی بات یہی ہے کہ تمہارا آپس کا معاملہ کیسا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ بقا اسی عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ آپ نماز۔ روزہ کا کہہ رہے ہیں۔ اسلام میں سب سے اہم رکن حج ہے۔ حج کے متعلق مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ دنیا میں اعلان کر دو اور لوگوں سے کہو کہ آؤ اور آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ہم تمہاری منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

معیارِ قومیت

الطاف :۔ آپ نے اپنے ارشادات میں علامہ اقبالؒ کا ذکر کیا تو میں انہی کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ جیسے انہوں نے ترکی اور ایران کی بات کرتے ہوئے کہا کہ ایسی ریاست جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہو اس میں نیشنل ازم

اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں بنتا۔ آپ پاکستان کے بارے میں فرمایئے کہ یہاں جو صورتِ حال ہے اس میں اسلام کا نیشنلزم کے ساتھ کوئی تضاد بنتا ہے؟

پرویز:۔ نیشنلزم سے آپ کی مراد کیا ہے۔ کسی خاص نسل کے لوگ یا ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام لوگ؟

الطاف:۔ تمام لوگ (بلا لحاظ مذہب)۔

پرویز:۔ یہی تو سارا جھگڑا تھا (انڈیا کے اندر) پاکستان کے مطالبے کی وجہ جواز یہی تھی کہ ہم اسے قومیت کی تشکیل کا معیار قرار نہیں دیتے تھے۔ مطالبۂ پاکستان کے مخالف کہتے تھے کہ اس علاقے کے اندر بسنے والے تمام لوگ خواہ وہ ہندو ہیں، سکھ ہیں، عیسائی، پارسی یا مسلمان ایک قوم ہیں۔ ہم کہتے تھے کہ اسلام کے نزدیک قوم کا معیار یہ نہیں، ہمارے نزدیک قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے۔ ہم نے پاکستان اسی اصول پہ بنایا تھا۔ پھر اس سوال کا مطلب کیا ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار کیا ہے۔ بہرحال قرآن کی رُو سے معیارِ قومیت اشتراکِ دین ہے۔ جب مدینے میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی تو مصر میں بسنے والا مسلمان بھی اس قوم کا فرد تھا۔ اور ایران کے اندر کا مسلمان بھی اس قوم کا فرد تھا۔ مسلمان جہاں بھی تھا اس کا فرد تھا۔ لیکن مکے کے اندر رہنے والا ابوجہل اس کا فرد نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مملکت کے اندر بسنے والے شہری کی حیثیت سے اس کو کچھ حقوق دیئے گئے۔ مراعات دی گئیں لیکن وہ اس قوم کا فرد نہیں قرار پاسکتا۔ اس لئے مملکت کے اندر رہنے والے مسلم اور غیر مسلم صرف اس بنا پر کہ وہ وہاں رہتے ہیں اسلام کی رُو سے ایک قوم نہیں قرار پاسکتے۔

ناجی:۔ اس کا مطلب ہے کہ جہاں جہاں بھی مسلمان بستا ہے، وہ مسلم قوم کا فرد ہے۔ اس حوالے سے تو ہم سب ایک قوم ہوئے۔ پھر جغرافیائی تقسیم کے کیا معنی ہیں؟ دوسرا سوال اس ضمن میں یہ کہ مولانا مودودی بھی نظریاتی سرحدوں پر زور دے کر جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت کو نظرانداز کرتے تھے آپ کے نقطۂ نظر میں اور مولانا مودودی کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہوا؟

پرویز:۔ فرق یہ ہے کہ جن حالات میں ہم اس وقت بس رہے ہیں ان کے حوالے سے اس علاقے (خطے کی) حفاظت مقدم ہے۔ قرآن نے خود ہی کہا ہے کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کیا کرو، کیونکہ سرحدوں کے مٹ جانے سے مملکت کا الگ تشخص ہی مٹ جائے گا۔ ایک حد ہماری ہے، ایک انڈیا کی، اس کے مٹ جانے سے آپ مٹ جائیں گے۔

الطاف:۔ مگر دوسری طرف ایران ہے۔

پرویز:۔ اگر دونوں اسلامی ریاستیں ہوں گی تو یہ حد نہیں ہوگی، لیکن جو ریاست اسلامی نہیں اس کے ساتھ ہم حد بندی کریں گے تو ہمارا تشخص قائم رہے گا۔

ناجی:۔ اسلامی ریاست سے آپ کی مراد اس جگہ کے رہنے والے لوگ ہیں یا حکمران۔ اگر لوگ، تو پھر افغانستان بھی اسلامی ریاست ہے؟

پرویز:- میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ آج کوئی بھی ریاست اسلامی نہیں۔ یہ سب مسلمانوں کی مملکتیں ہیں اسلامی ریاست میں عوام اور حاکم کا بھی کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ وہاں حاکم بھی کوئی نہیں ہوتا محکوم بھی کوئی نہیں ہوتا سب احکامِ خداوندی کے محکوم ہوتے ہیں۔

فاروق:- آپ نے فرمایا تھا کہ ایران اور عراق ......

پرویز:- میں نے آج کا ایران اور عراق نہیں کہا تھا میں نے شرط عائد کی تھی کہ اگر وہ دونوں اسلامی مملکتیں بن جائیں تو پھر ان میں حد نہیں رہے گی۔ اس صورت میں ایک ہی اُمّت ہو گی اور اس کا ایک ہی ضابطہ۔ آپ انتظامی سہولتوں کی خاطر ان کا الگ الگ تشخص بھی قائم رکھ سکتے ہیں جس طرح ایک ریاست کے اندر مختلف صوبے ہوتے ہیں وہ محض انتظامی سہولت ہو گی۔ ہو سکتا ہے ہم پاکستان اور ایران کی اسلامی مملکتوں کی یہی شکل رکھ لیں لیکن دونوں میں اُمّت ایک ہو گی۔ پوری دنیا کے اندر بسنے والے مومن ایک ہوں گے۔ جب مقصد بھی ایک ہوگا (دین کا قیام) تو نظام بھی سب کا ایک ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ مقامی حالات کے مطابق ان کے نظم و نسق میں کچھ فرق ہو لیکن ان سب کا نصب العین واحد ہوگا۔ قرآن کی فرماں روائی۔

فنڈامینٹل ازم

ناجی:- آپ نے اُمّتِ واحدہ کے تصوّر کا ذکر کیا اس سلسلے میں ایک تحریک دنیا بھر میں چل رہی ہے اسے اسلامک فنڈامینٹلزم کہا جاتا ہے، یا احیائے اسلام کی تحریک۔ اس وقت اخوان المسلمون ہیں، انڈونیشیا میں مسجدی پارٹی ہے سعودی عرب میں بھی جن لوگوں نے کارروائی کی، انہوں نے بھی بنیاد پرستی کا نام لیا۔ ہمارے یہاں بھی اسی طرح کی تحریک چل رہی ہے ایران میں بھی چل رہی ہے اور دوسرے مسلم ممالک میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک احیائے اسلام (دین) کے فروغ کا کوئی سلسلہ ہے۔ مزید یہ کہ مولانا مودودی نے بھی ایک جگہ فرمایا ہے کہ اصل چیز نظریاتی سرحدیں ہوتی ہیں جغرافیائی سرحدیں نہیں آپ نے بھی یہ فرما دیا کہ اسلامی مملکت نام کی کوئی چیز اس وقت موجود نہیں تو ظاہر ہوا کہ اسلامی مملکت کی سرحدیں بھی موجود نہیں۔ اس صورت میں سرحدوں کا تصوّر کیا رہ جاتا ہے؟ آپ نے تو اسلامی مملکت کے وجود کو تسلیم نہ کر کے جغرافیائی سرحدوں کا مسئلہ ہی ختم کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ قرآن کے طالب علم ہیں، مولانا مودودی نے بھی ایک کتاب تفہیم القرآن لکھی ہے اس میں اسلامی مملکت کے کیا خط و خال ملتے ہیں۔ کیا وہ آپ کی اسلامی مملکت سے ملتی ہے؟

پرویز:- پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ مودودی صاحب نے جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت کو کم کرنے کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ موجودہ حالات میں تباہی کی طرف جانے والی بات ہے۔ اس سے تو مملکتِ پاکستان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ آج کے دور میں جغرافیائی سرحدوں سے ہی مملکت کا تشخص اُبھرتا ہے اس لئے ان کا قائم رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اور قرآن نے انہی حالات میں کہا تھا "اپنی سرحدوں کی حفاظت

کرو۔ بھارت اور ہمارے درمیان جغرافیائی سرحد کو قائم رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ہمارے اور افغانستان کے درمیان بھی اسی طرح کی جغرافیائی سرحد ہے۔ اگر اسلامی مملکت کی بات کریں تو ہم اور بھارت میں تو جغرافیائی سرحد برقرار رہے گی لیکن ایران یا افغانستان میں اگر اسلامی مملکتیں ہوں گی تو سرحدوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں نے مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں کو غیر اسلامی کہہ کر جغرافیائی سرحدوں کو ختم نہیں کر دیا ان کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

دوسری بات آپ نے فنڈامینٹلزم کی کہی ہے یہ ایک بڑی گہری سازش ہے۔ اقبالؒ نے بہت پہلے اس خطرہ کی نشاندہی کی تھی۔ قرآن یا اسلام کی رو سے اسلامی مملکت وہ تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے ادوار میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بعد خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور عباسیوں کے دور میں یہ پروان چڑھی کیونکہ اس دور میں تاریخ، روایات، فقہی قوانین، مختلف عقائد و نظریات مرتب ہوئے اور وہ تین عناصر جو نوعِ انسانی کے لئے لعنت ہیں اور جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، یعنی شخصی حکومتیں، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ اقبالؒ اس اسلام کو عجمی اسلام کہہ کر ...... پکارتا ہے اور یہی وہ اسلام ہے جو مسلمانوں کے ہاں رائج چلا آ رہا ہے۔ اب زمانے کے تقاضوں سے یہ خلافِ انسانیت عناصر آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے بعض ممالک میں ان کے خلاف آوازیں بھی بلند ہونا شروع ہوئیں اور وہاں کے مفکرین نے قرآنی نظام کے قیام کی دعوت بھی دی۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام، شخصی حکومتوں، تھیاکریسی اور نظامِ سرمایہ داری کی حامی مملکتوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ ان میں مسلمانوں کی شخصی حکومتیں اور اقوامِ مغرب سب شامل ہیں۔ انہوں نے باہمی سمجھوتے سے یہ طے کیا کہ قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ پاکستان کا مطالبہ قرآنی نظام کے قائم کرنے ہی کی طرف دعوت تھی اس لئے انگریز، ہندو اور ہمارے علماء کی طرف سے (باستثنائے چند) اس کی بہت مخالفت ہوئی۔ ان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں ایک کل ہندوستان ہندو کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کے صدر مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں قرآن کی حکمرانی ہوگی۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں پوچھتا ہوں نیشنلسٹ علماءؒ سے کہ کیا آپ نے عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کیا ہے؟ سامعین میں ایک مفتی صاحب نے پکار کر کہا کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اس مخالفت کی آگ سلگتی چلی آ رہی تھی لیکن پچھلے دنوں یہ خاصی تیزی سے بھڑک اٹھی۔ اس مخالفت کا طریق کار یہ سوچا گیا کہ مسلمانوں میں اس خیال کو عام کیا جائے کہ حقیقی اور بنیادی اسلام وہی ہے جو عباسیوں کے زمانے میں ایجاد ہوا تھا۔ اس تحریک کا نام فنڈامینٹل ازم ہے۔

ہمارے ہاں کی شخصی حکومتیں، مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب سب اس کی کامیابی کے لئے متحد اور متفق ہیں۔ آپ نے کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ ہمارے علماء حضرات جن کی ابھی کل تک یہ حالت تھی کہ ان کے پاس ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے کے لئے بھی کرایہ تک نہیں ہوتا تھا اب ہوائی جہازوں پر

ساری دنیا کے چکر لگا رہے ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔ ان ممالک میں "اسلامک سنٹر" کھلے ہوئے ہیں جہاں اس عجمی اسلام کے فروغ کے لئے سیلاب کی طرح روپیہ بہایا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی نگاہِ دوررس نے بہت عرصہ پہلے اس خطرہ کو بھانپ کر قوم کو اس سے متنبہ کیا تھا ان کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میرے خیال میں ان کے سارے کلام میں اس جیسی مؤثر اور بلیغ نظم کوئی نہیں۔ اس میں انہوں نے ابلیس کی زبان سے کہلایا ہے کہ اس امّت کو قرآن سے دُور رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں عجمی اسلام کو عام کر دیا جائے اس کے پروگرام کا مقطع کا شعر ہے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

الغرض۔۔۔ اشارات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ سازش کیا ہے اور اس میں کون کون شریک ہے۔ علامہ اقبالؒ کے بعد میری ساری عمر اس سازش کو بے نقاب کرنے میں گذری ہے اور یہ اسی کی پاداش میں ہے کہ ہمارا مذہب پرست طبقہ میری اس قدر مخالفت کرتا ہے اور میرے خلاف جھوٹے الزامات تراش کر کفر کے فتوے صادر کرتا ہے۔

الطاف:۔ آپ نے پہلے یہ فرمایا کہ نظریاتی سرحدیں اہم ہیں اور جغرافیائی غیر اہم، پھر آپ اس سے اختلاف رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ صورت میں جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت بھی ضروری ہے تو فرمایئے کہ موجودہ صورت میں جب کہ فی الحال اسلامی ریاست کا قیام عمل میں نہیں آیا اس میں زبان نسل یا طبقاتی تفریق کی رُو سے قومیت کا تصوّر قائم کر لیا جائے تو اس پر کیا اعتراض ہوگا؟

پرویز:۔ معاف فرمایئے! میں نے کہا یہ تھا کہ ملحقہ اسلامی مملکتوں میں جغرافیائی سرحدوں کی ضرورت نہیں رہے گی لیکن جب تک یہ مملکتیں اسلامی نہیں ہو جاتیں اس وقت تک جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت بڑی ہے اور ان کی حفاظت بہت ضروری باقی رہی قومیت کے معیار میں تبدیلی تو ہمارے ہاں قومیت کے قرآنی معیار برقرار رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم نے ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ اس بناء پر کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت اشتراکِ دین کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اگر ہم اس معیار سے انکار کر دیں گے تو ہماری مملکت کے جُداگانہ وجود کی وجہ جواز کوئی نہیں رہے گی اور یہ مطالبہ اٹھ کھڑا ہوگا کہ پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ ہر چند اس وقت ہماری مملکت اسلامی نہیں لیکن اس کے باوجود اس خطۂ زمین کی حفاظت ضروری ہے کہ اس سے قرآنی حکومت کے قیام کا امکان تو ہے اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو قرآنی حکومت کو قائم کہاں کیا جائے گا؟

قائدِ اعظمؒ کی اگست ۴۷ء کی تقریر

ناجی:۔ قائدِ اعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ وہ سیکولرازم کے حامی

تھے۔ مرحوم جسٹس منیر نے بھی اپنی کتاب میں یہی کہا ہے اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

الطاف:۔ میں مزید عرض کروں گا کہ اسلام کا جو تصوّر آپ نے پیش کیا ہے "اس کی رُو سے تسخیرِ کائنات مسلمان کا اوّلین فریضہ ہے اس سے تو خود اسلام ہی سیکولر نظر آتا ہے اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

پرویز:۔ میں پہلے الطاف صاحب کے سوال کی طرف آتا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا ہمارے ہاں بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم جو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، ان کے دائرہ کار کا تعین نہیں کرتے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سیکولرازم کہتے کسے ہیں۔ مغربی نظامِ سیاست کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ قوم اپنے لئے جو فیصلے کرلے وہ قولِ فیصل ہوتے ہیں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ یعنی ان کے نزدیک قانون سازی کا بلا حدود و قیود اختیار قوم کو حاصل ہوتا ہے اسے سیکولرازم کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کا اصول یہ ہے کہ قوم بلکہ پوری کی پوری عالمگیر انسانیت بھی بلا حدود و قیود فیصلے کرنے کی مجاز نہیں۔ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی فیصلے کرسکتی ہے جو خدا نے متعیّن کئے ہیں اور انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہ ہے فرق اسلام اور سیکولرازم میں، میں نے جب کہا تھا کہ تسخیرِ کائنات مسلمانوں کا اوّلین فریضہ ہے تو یہاں تک بات سیکولر تھی کیونکہ ایسا مسلم اور غیرمسلم سب کرسکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمان فطرت کی قوتوں کو حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے صرف کریں گے۔ اس سے سیکولرازم اسلامی ہوجاتا ہے۔ اب رہی قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر تو اس کے متعلق میں بڑی تفصیل سے لکھتا چلا آرہا ہوں اور مرحوم جسٹس منیر کے اعتراضات کا میں نے تفصیلی جواب بھی دیا تھا جو آپ کو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ ——— "حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ ——— میں ملے گا۔ سرِدست میں اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس کا جو جواب ایک غیر مسلم اہلِ فکر جوشواہ فضل الدین نے دیا تھا وہ بڑا مسکت تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس تقریر سے غیرمسلم یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ قائدِ اعظمؒ سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے وہ خالص اسلامی سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا ملخص یہ تھا کہ یہاں جو حقوق اور مراعات مملکت کے شہری ہونے کی بنا پر دیئے جائیں گے ان میں مسلم اور غیرمسلم میں فرق نہیں کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے مسلم اور غیرمسلم ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔

فاروق:۔ آپ نے فرمایا ہے کہ سیکولرازم کے حامی غیر متبدّل قوانین کے قائل نہیں لیکن وہ قوانینِ فطرت کو مانتے ہیں جو غیر متبدّل ہیں پھر اس میں اور قرآنی نظریے میں کیا فرق ہے؟

پرویز:۔ قوانینِ فطرت کا تعلق طبیعی کائنات اور خود انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس میں کافر اور مومن تو ایک طرف، انسان اور حیوان میں بھی فرق نہیں۔ لیکن جن قوانینِ خداوندی کا اسلام ذکر کرتا ہے ان کا تعلق انسانی زندگی کی اقدار سے ہے۔ حیوانات کے ہاں تو اقدار کا تصوّر ہی نہیں سیکولرازم کے حامی بھی اقدار کے قائل نہیں۔ اس اعتبار سے قرآن انہیں حیوانی زندگی کی سطح پر ہی رکھتا ہے۔

الطاف:۔ اسلامی ریاست کے تصوّر میں آپ کے اور مودودی صاحب کے مؤقف میں کیا فرق ہے؟

مرحوم مودودی صاحب

پرویز:- بنیادی فرق! مودودی صاحب، اُس اسلام کا احیاء چاہتے تھے جسے میں نے عجمی اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یہ تجویز انہیں کی پیش کردہ تھی کہ پاکستان میں حنفی فقہ نافذ کر دی جائے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ وہ حنفی فقہ کو منجمد شاستر قرار دیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تجویز کر دیا کہ پاکستان میں اس فقہ کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ منجمد شاستر تو اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ وہ نافذ العمل ہو سکے۔ حنفی فقہ کے جو چند قوانین یہاں نافذ کئے گئے ہیں ان کے متعلق خود صدر پاکستان یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ ان کا عمل میں لایا جانا ناممکن ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ مودودی صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ حنفی فقہ اس قدر ناقابلِ عمل ہے اسے مملکت کے قوانین بنانے کی تجویز کیوں کی تھی؟ وہ آخر تک مطالبۂ پاکستان کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا تصور ایک عملی شکل اختیار کر چکا تھا انہوں نے مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں کا دورہ شروع کیا اور ان سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تقسیمِ ہند سے اکثریت والوں کو تو ایک مملکت مل جائے گی اور تمہارا یہاں حشر کیا ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ آخری حربہ کے طور پر ان لوگوں کو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت پر اکسایا جائے۔ وہاں تو یہ ناکام رہ گئے یہاں انہوں نے ایسے قوانین نافذ کرنے کی تجویز کر دی جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن العمل ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہماری نئی نسل اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے اور اس طرح نہ صرف وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائے بلکہ یہ خیال بھی ان کے دل میں اُبھرے کہ پاکستان کے جداگانہ مملکت رکھنے سے حاصل کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ غیر مسلم اقوام کے دل میں جو اسلام کا بھرم چلا آ رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

اسلامی قوانین

فاروق:- عموماً وکلاء یہ کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین نام کی کوئی چیز نہیں۔ اصل میں یہ عرب روایات تھیں جو دو ایک ترامیم کے ساتھ اسلام کے بعد اپنا لی گئیں۔

پرویز:- جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اسلامی مملکت اپنے حالات کے مطابق جزئی قوانین خود وضع کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے کی اسلامی مملکت نے کچھ ایسے قوانین بھی اپنا لئے ہوں جو عربوں میں پہلے سے رائج تھے اور وہ قرآن کی حدود سے ٹکراتے نہیں تھے۔

فاروق:- اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب کی روایات کا اپنانا ضروری نہیں۔

پرویز:- عرب کی روایات ہی نہیں کسی زمانے کی روایات بھی ہوں وہ غیر متبدل نہیں ہو سکتیں اس لئے اسلامی مملکت پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ انہیں بالضرور اپنائے۔ ان میں سے جسے وہ اپنے حالات کے مطابق سمجھے اپنا لے۔ سوال صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کی حدود سے ٹکراتی نہیں۔ یہ ہے میری بصیرتِ قرآن کی رُو سے اسلامی ریاست کا تصور۔ آپ احباب کا شکریہ کہ آپ نے گہری توجہ سے میری معروضات کو درخورِ اعتنا سمجھا۔

(۷)

سربستہ حقیقتیں بے نقاب ـــــ اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نورِ حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو روحانیت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہو گئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی تازہ ترین تصنیف

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو باب ہیں ـــ اوّل، تصوّف اور اسلام ـــ دوم، تصوّف اور اقبالؒ ـــ مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ ـــ کتابت، طباعت کاغذ عمدہ ـــ جلد مزیّن اور مطلّا ـــ ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/۷۵ روپے (محصول ڈاک -/۵ ")

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

پختونستان کی کہانی

(پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا)

اس وقت، جب کہ یہ بدنصیب ملک ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے، بعض گوشوں سے اس قسم کے شوشے چھوڑے جاتے ہیں جن سے ملک کا انتشار اور بڑھ جائے۔ اس کی ایک تازہ مثال خان عبدالولی خان صاحب کا انٹرویو ہے جو بعض اخبارات (بالخصوص ہفت وار چٹان بابت ۲۱ دسمبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت اس قسم کے انٹرویو کی اشاعت کی ضرورت کیا تھی؟ خدا کرے کہ (بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہو کہ) اس کے ڈانڈے کہیں روس اور افغانستان کے تازہ عزائم سے نہ ملے ہوئے ہوں۔ اس سے ملک میں ایک عام بحث چھڑ گئی ہے ——— جس قوم کے سامنے کوئی متعین نصب العین نہ ہو، وہ اسی قسم کے مشغلوں میں اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کیا کرتی ہے۔

ہم اس بحث میں قطعاً نہیں پڑنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے پاس "تاریخ تحریک پاکستان" کے کچھ طالب علم آئے جنہوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں پختونستان کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے لیکن ہمیں اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں۔ نہ ہی ہمارے نصاب کی کتابوں میں اس کے متعلق کوئی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس وقت، لے دے کے، طلوعِ اسلام ہی ایسا ادارہ ہے جس کا اس تاریخ سے تسلسل چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ پختونستان کے متعلق ضروری معلومات یک جا کر دے تو اس سے نہ صرف، موجودہ نسل کے طالب علم مستفید ہو سکیں گے بلکہ آئندہ کے لئے بھی یہ تاریخ کا ایک اہم جزو بن جائے گا۔ ہمیں ان کی دلیل میں وزن نظر آیا، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس تحریک کے نمایاں خط و خال (مختصر طور پر) منضبط کرائے جائیں۔ اس سلسلہ میں ہم نہ محترم عبدالولی خان صاحب سے کسی بحث میں الجھنا چاہتے ہیں، اور نہ ہی ان کے انٹرویو اور دیگر متعلقہ بیانات پر کسی قسم کی تنقید کرنا۔ واقعات جو پیش خدمت قارئین کئے جا رہے ہیں وہ از خود یہ دونوں تقاضے پورے کر دیں گے اور قوم کے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں ممد و مددگار ہوں گے۔

یوں تو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت مسلمانوں کی (کم و بیش) تمام پارٹیوں اور جماعتوں کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن اس کی منظم اور مسلسل مخالفت (سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور) خان عبدالغفار خان صاحب نے کی تھی۔ خان صاحب کی پارٹی کا نام خدائی خدمتگار یا سُرخ پوش تھا۔ ان کا شمار کانگرس کے ممتاز لیڈروں میں ہوتا تھا۔ (مسٹر) گاندھی کے یہ اس قدر پرستار تھے

کر "سرحدی گاندھی" کہلاتے تھے۔ جب تقسیم ہند کا اصولی فیصلہ ہوگیا تو باقی پارٹیوں اور جماعتوں نے اسے (بامر مجبوری ہی سہی) تسلیم کر لیا لیکن خان صاحب کی مخالفت اور شدت اختیار کر گئی۔ جب تقسیم ہند کا مسئلہ (بغرض منظوری) کانگرس ورکنگ

آخری وقت تک مخالفت

کمیٹی میں پیش ہوا تو اس وقت خان صاحب کی حالت کیا تھی، اس کے متعلق (کسی مخالف کی زبان سے نہیں، مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے الفاظ میں سنئے۔ انہوں نے اپنی کتاب (انڈیا ونز فریڈم) میں لکھا ہے۔

> جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی جی نے بھی مطالبۂ پاکستان کی تائید کر دی، تو اس پر مجھے چنداں حیرت نہ ہوئی کیونکہ اس کی بھنک میرے کانوں میں پہلے سے پڑ چکی تھی۔ لیکن خان عبدالغفار خان کے ردعمل کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ اور چند منٹوں تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ایک لفظ تک بھی نہیں بول سکتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مہر سکوت کو توڑا اور کانگرس ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی کہ وہ تقسیم ہند کی تجویز منظور نہ کرے۔ انہوں نے کہا، "میں نے ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیا ہے۔ اگر کانگرس نے اب میرا ساتھ چھوڑ دیا تو سرحد کے لوگوں پر اس کا اثر بڑا خطرناک ہوگا۔ میرے دشمن مجھ پر ہنسیں گے اور دوستوں تک کہیں گے کہ جب تک کانگرس کو سرحد کی ضرورت رہی انہوں نے خدائی خدمتگاروں کی حمایت کی۔ لیکن جب اس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کا فیصلہ کیا تو اس نے تقسیم ہند کے مطالبہ کی تائید کر دی اور اس باب میں سرحد اور سرحد کے لیڈروں سے مشورہ تک کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ خان عبدالغفار خان نے بار بار کہا کہ اگر کانگرس نے اب خدائی خدمتگاروں کا ساتھ چھوڑ کر انہیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا تو سرحد کے لوگ اسے کانگرس کی طرف سے غداری قرار دیں گے۔" (صفحہ ۱۹۲)

آپ نے غور فرمایا کہ خان صاحب، اہل پاکستان کو کیا سمجھ رہے تھے؟ ــــ بھیڑیئے! اس سے آپ اس نفرت اور عداوت کی شدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، جو ان کے دل میں پاکستان کے خلاف موجزن تھی۔

(مولانا) آزاد (مرحوم) نے لکھا ہے کہ خان عبدالغفار خان کی اس اپیل کا، گاندھی جی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس مسئلہ پر لارڈ مونٹ بیٹن سے بات کریں گے۔ اس بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس کے متعلق (آزاد مرحوم) نے لکھا ہے:

> مونٹ بیٹن پلان اس اصول پر استوار تھا کہ مسلمان اکثریت کے صوبوں کو علیحدہ کر کے ان کی ایک آزاد الگ مملکت بنا دی جائے۔ سرحد میں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں تھے۔ اس اعتبار سے اسے ہر حالت میں پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ جغرافیائی نقطہ نگاہ سے بھی سرحد مجوزہ مملکت پاکستان کی سرحدوں کے اندر واقع تھا۔ اس کا ہندوستان کے ساتھ کوئی رابطہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ (صفحہ ۱۹۳-۱۹۲)

سرحد میں ریفرنڈم

لیکن اس کے باوجود لارڈ مونٹ بیٹن نے فیصلہ کیا کہ سرحد میں ریفرنڈم کرایا جائے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا پاکستان کے ساتھ؟ خان عبدالغفار خان، اور ان کے بھائی، ڈاکٹر خان صاحب نے (جو اس زمانہ میں سرحد میں کانگرس حکومت کے وزیر اعلیٰ تھے) ریفرنڈم کی تجویز سے اتفاق کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اہل سرحد سے اتنا ہی نہ پوچھا جائے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ، بلکہ پوچھا یہ جائے کہ وہ

۱۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ یا

۲۔ پاکستان کے ساتھ۔ یا

۳- اپنی الگ آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا نام پختونستان ہوگا۔

لارڈ ماونٹ بیٹن نے اس آخری (تیسری) شق کو نامنظور کر دیا اور خان برادرز نے ریفرنڈم کو بائیکاٹ کر دیا۔ (مولانا) آزاد نے اس پر کہا تھا کہ:

> یہ باور کرنے کے لئے معقول وجوہات موجود ہیں کہ اگر ریفرنڈم میں آزاد پختونستان کی شق شامل ہوتی تو صوبہ سرحد کی اکثریت اس کے حق میں ووٹ دیتی۔ انہیں خطرہ تھا کہ پنجاب انہیں ہضم کر لے گا اور تنہائی احساس انہیں پاکستان کے خلاف ووٹ دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ جوق در جوق اس کے خلاف ووٹ دیتے۔ (ص ۱۹۵)

خان عبدالغفار خان نے اپنے مطالبۂ آزاد پختونستان کو یہیں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ وہ اس باب میں مختلف لیڈروں کو خطوط بھی لکھتے رہے تھے۔ یہ خطوط اس زمانے میں تو صیغۂ راز میں رہے لیکن کانگرس نے انہیں ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا۔ روزنامہ

خان صاحب کے خفیہ خطوط

امروز کی ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں مرغوب صدیقی (مرحوم) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے ان خطوط کو نقل کیا تھا۔ خان صاحب نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو (مسٹر) گاندھی کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

> آج شام صوبہ سرحد کی کانگرس پارلیمانی کمیٹی اور خدائی خدمتگاروں کا ایک اجلاس ہوا جو چار گھنٹے جاری رہا۔ صوبہ بھر سے تمام نمائندوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس اجلاس کی عام رائے یہ تھی کہ ہم برطانوی منصوبہ کے پیراگراف چار کے تحت استصواب رائے میں حصہ نہ لیں۔ یہ تمام لوگ چاہتے تھے کہ استصواب رائے اس امر پر ہو کہ صوبہ سرحد پاکستان کا حصہ ہو یا وہاں ایک آزاد پٹھان مملکت قائم ہو۔

انہوں نے ۱۲ جون کو قائد اعظم کو بھی ایک خط لکھا تھا جس میں آزاد پختونستان کے مطالبہ کو دہراتے ہوئے یہ (THREAT) بھی دیا تھا کہ:

> تمام پٹھانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنے اس ہر دلعزیز مقصد کے حصول کے لئے متحد ہو جائیں اور کسی قسم کے غیر پختون غلبہ کے سامنے ہرگز سر نہ جھکائیں۔

خان صاحب ہی نہیں ان کے ساتھ ہندو لیڈر بھی اس قسم کے خطوط لکھ رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸ جون ۱۹۴۷ء کو کانگرس کے صدر اچاریہ کرپلانی نے لارڈ ماونٹ بیٹن کو ایک خط کے دوران لکھا کہ سرحد کا اصل مسئلہ کسی ہندو مسلم تنازعہ کو طے کرنا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ سرحد میں کسی طرح ایک آزاد پٹھان مملکت قائم کی جائے۔

اس کے بعد ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو مسٹر گاندھی نے لارڈ ماونٹ بیٹن کو لکھا کہ انہیں خان عبدالغفار خان نے لکھا تھا کہ چونکہ وہ ایک آزاد پٹھان مملکت کے وجود میں لانے کے سلسلہ میں ناکام رہے تھے اس لئے وہ ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس کے بعد ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسٹر گاندھی نے خان عبدالغفار خان کو ایک خط میں لکھا (جسے وائسرائے کے ذریعے بھیجا گیا تھا) کہ خدائی خدمتگار ریفرنڈم میں کوئی حصہ نہ لیں کیونکہ جہاں تک ان کے داخلی امور کا تعلق ہے ان کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ ان کو ایسی خود مختاری حاصل ہو جس میں بھارت اور پاکستان مداخلت نہ کر سکیں۔ اور جہاں تک بھارت اور پاکستان میں سے ایک کو منتخب کرنے کا تعلق ہے یہ فیصلہ وہ اس وقت کریں جب نہ صرف بھارت اور پاکستان کے آئین بن جائیں بلکہ سرحد کے لوگ بھی اپنا خود مختاری

پرمبنی آئین تیار کریں۔

یہ تھے خان عبدالغفار خان کے خیالات اور سرگرمیاں اس وقت جب انگریز اور ہندو دونوں قیام پاکستان پر رضامند ہو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں (مسٹر گاندھی کی اس) نہایت شرانگیز تجویز کو بھی ذہن میں رکھئے جس کی رو سے پٹھانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ انہیں ایسی خود مختاری حاصل کرنے کا حق حاصل ہے جس میں بھارت اور پاکستان مداخلت نہ کر سکیں۔

اس چنگاری کو خاص طور پر نگاہوں کے سامنے رکھنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اس کے بعد خان عبدالغفار خان۔

حق خود ارادیت

(اور خان عبدالولی خان) آزاد پختونستان کے بجائے "حق خود ارادیت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ عملی طور پر ان دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ ایسی "خود مختاری جس میں پاکستان دخل نہ دے سکے" کامل آزادی نہیں تو اور کیا ہے؟

اسی حق خود ارادیت یا خود مختار صوبہ کی تجویز کو لے کر خان عبدالغفار خان آگے بڑھے اور پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ہم تمام پٹھانوں کے لئے پاکستان میں ایک خود مختار علاقہ چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ وہی ہے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈیورنڈ لائن سے مشرق کی طرف تمام پٹھان متحد ہو جائیں۔ اور اس مقصد کے لئے ہم آپ کی امداد چاہتے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز - ۳/۴۸ ۷)

یعنی ایک خود مختار مملکت (پاکستان) کے اندر ایک خود مختار علاقہ کا مطالبہ اور اس کا مقصد بتایا جاتا ہے پٹھانوں کا اتحاد! پھر تماشا یہ کہ اس اتحاد کو جس کی بنا خالص نسل پرستی پر استوار ہے، اسلام کا مطالبہ کہہ کر پکارا جاتا ہے ——— آہ بے چارہ اسلام!

نسل پرستی

پھر کہا کہ "ہمیں یہاں خلفائے راشدین کے انداز پر حکومت قائم کرنی ہے" اس خلافت راشدہ کے انداز کی حکومت کہ جس میں ایک دفعہ دو سپاہیوں میں جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلے کا نام لے کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت برافروختہ ہوئے اور فوج کے مدار المہام حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو فوراً ایک مراسلہ بھیجا۔ جس میں (علاوہ دیگر امور) لکھا کہ:

مجھے اطلاع ملی ہے کہ قبیلہ ضبّہ کے بعض افراد نے "یا آلِ ضبّہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو انہیں سخت سزا دو تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔ یاد رکھو! اگر کبھی قبائلی تنازعہ ابھرے اور کوئی شخص "یا آلِ فلاں" کہہ کر آواز دے تو سمجھو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والوں کی تلوار سے خبر لو۔ (شاہکار رسالت صفحہ ۱۴۰)

لیکن خان صاحب تو اسلام کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر دلیپ مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

چند سال پہلے کا پاکستان مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتوں کی تعمیر کرنی ہو گی۔ (بحوالہ جسارت کراچی - مورخہ ۳/۴ ۷۲)

آپ غور کیجئے کہ مطالبہ پاکستان میں نزاع کس بنیادی سوال پر تھی؟ اس پر کہ قائد اعظمؒ (مسلم لیگ) کا دعویٰ تھا کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قومیت کے افراد ہیں اور ہندو (اور نیشلسٹ مسلمان) اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے تھے کہ قومیت کی تشکیل سیکولر بنیادوں پر (ملک کے اشتراک سے) ہوتی ہے۔ اگر سرحدی گاندھی صاحب کی بات تسلیم کر لی جائے تو پاکستان

جداگانہ وجود ہی ختم ہو جاتا ہے ——— اور یہی ان کا منشا بھی ہے۔

بات حقِ خود ارادیت کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اسے اور آگے بڑھایا۔ پہلے یہ مطالبہ صوبہ سرحد تک محدود تھا۔ بعد ازاں اسے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں پر پھیلا دیا۔ ۱۹۷۲ء میں ان حضرات کی نیشنل عوامی پارٹی کا ایک کنونشن کراچی میں منعقد ہوا جس میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ:

> پارٹی کا موقف یہ ہے کہ پاکستان متعدد قومیتوں پر مشتمل ایک ملک ہے جو مساوی حقوق کی مستحق ہیں۔ اور یہ مسئلہ حقِ خود ارادیت کے اصول پر عمل کر کے ہی حل ہو سکتا ہے۔ (امروز لاہور۔ مورخہ ۸ر فروری ۱۹۷۲ء)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حقِ خود ارادیت درحقیقت مطالبۂ علیحدگی ہی کی نقاب پوش شکل ہے۔ بعض اوقات (ہزار کوششوں کے باوجود) یہ نقاب سرک جاتی ہے تو عریاں حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ جولائی ۱۹۷۴ء میں ایک پریس کانفرنس میں خان عبدالولی خان پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے علیحدگی کا مسلک کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:

> خود قائداعظمؒ علیحدگی کی تحریک کے بانی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی۔ اب اگر کوئی قائداعظمؒ کے پیروکار بنتے ہیں تو مستحقِ سزا قرار پاتے ہیں۔ (نوائے وقت ۲۰ر جولائی ۱۹۷۴ء)

اگرچہ بعد میں انہوں نے کہا تھا کہ انہوں نے قائداعظمؒ کا نام نہیں لیا تھا، لیکن اپنے مسلکِ علیحدگی سے انکار نہیں کیا تھا۔ آپ ایک ثانیہ کے لئے رک کر ان حضرات کے مسلکِ علیحدگی پر غور کیجئے۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ کانگرس کے ہم نوا تھے اور آخر تک کوشش کرتے رہے کہ ملک تقسیم نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں انہیں ہندوستان کے اندر، ہندوؤں کے ساتھ رہنا تھا۔ اس وقت انہوں نے نہ تو ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ پیش کیا نہ ایک خود مختار علاقہ کا۔ حتیٰ کہ انہوں نے نسل کی بنیاد پر پٹھانوں کی الگ قومیت کا بھی دعویٰ نہ کیا۔ یہ ہندوستان کا جزو، اور ہندوستانی قوم کا آ ٹوٹ انگ، (ناقابلِ تقسیم عضو) بن کر رہنے کے لئے نہ صرف رضامند تھے بلکہ اس پر مصر تھے۔ لیکن جونہی مسلمانوں کی ایک الگ مملکت متشکل ہوئی سرزمینِ سرحد کی علیحدگی اور پٹھانوں کی جداگانہ قومیت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جذبۂ محرکہ مسلمانوں کے خلاف جذبۂ نفرت و عداوت تھا جسے (خان عبدالغفار خان نے) "تعبیر بد" کہہ کر پکارا تھا۔

افغانستان اور بھارت کے ساتھ تعلقات

آپ نے دیکھا ہو گا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، خان عبدالغفار خان بیشتر افغانستان میں رہتے اور ماسکو اور بھارت میں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے تعلقات کس قسم کے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۹۴۸ء میں جب حکومتِ پاکستان نے خان برادران (خان عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب) کے خلاف تادیبی کارروائی کی اور سرخپوشوں کو خلافِ قانون قرار دیا، تو بھارت کی پارلیمان میں یہ سوال اٹھایا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ بین المملکتی قیدیوں کے تبادلہ کے سلسلہ میں خان برادرز کو ہندوستان منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے جواب میں وہاں کے وزیرِ بے محکمہ مسٹر آئنگر نے کہا کہ:

> پاکستان کو اس کے "اعمالِ بد" سے باز رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ خان برادرز وہیں رہیں۔

وہاں کے اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک انتہائی زہر آلود اداریہ سپردِ قلم کیا اور نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ایک بیان میں کہا کہ:

صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں پر نت نئے مظالم کی جو اطلاعات ہم تک پہنچ رہی ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو قیوم وزارت کا طرزِ عمل نہایت قابلِ افسوس اور مذموم ہے۔ سُرخپوش، قوم کے سچے خادم ہیں اور انہوں نے جنگِ آزادی میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ میں حکومت سرحد کو متنبہ کرتا ہوں کہ اسلام کے جعلی نام پر ان فسطائی اطوار کو قوم برداشت نہیں کرے گی۔ (ہندوستان ٹائمز، ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء)

اس بیان میں جو دو بار "قوم" کا لفظ آیا ہے، آپ غور کیجئے کہ اس سے کون سی قوم مراد ہے؟ بلاشبہ ہندوستانی قوم۔ یہی تھی وہ قوم جس کے "سُرخپوش" سچے خادم تھے اور وہی قوم ان پر "مظالم" کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ آپ غور فرمائیے کہ تشکیل پاکستان کے بعد بھی، سُرخپوشوں کا بھارت کے ساتھ کس قسم کا تعلق تھا۔

اب آئیے افغانستان کی طرف۔ خان عبدالغفار خان، وحدت مغربی پاکستان کے سخت خلاف تھے۔ ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کا حق حاصل تھا کہ جس اقدام کو وہ اچھا نہیں سمجھتے اس کی آئینی اور قانونی انداز سے مخالفت کریں۔ لیکن بات سرحد سے آگے بڑھ چکی تھی۔ انہی دنوں افغانستان کے وزیر اعظم سردار داؤد خان نے خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر اعظم پاکستان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ بخوشی تشریف لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے پہلے آنا چاہتے ہیں۔ اسے بھی منظور کر لیا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ۱۴ اکتوبر سے پہلے نہیں آ سکتے۔ اس کے بعد کی کوئی تاریخ مقرر کی جائے اور ساتھ ہی یہ شرط عائد کر دی کہ:

ملاقات تک، وحدتِ مغربی پاکستان کے منصوبہ پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

آپ غور کیجئے کہ کسی مملکت کے وزیر اعظم کو اس کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری مملکت کے اندرونی معاملات میں نہ صرف دخل اندازی کرے بلکہ یہ شرط بھی عائد کر دے کہ اس کی ملاقات تک، حکومتِ پاکستان اپنے منصوبے پر عمل پیرا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ حکومتِ پاکستان نے اس شرط کے ماننے سے معذرت چاہی۔ اس پر سردار صاحب سخت ناراض ہو گئے اور کراچی میں متعین افغانی سفیر کو واپس بلا لیا۔

سفیر (سردار عتیق خان صاحب) نے جاتے جاتے ایک پریس کانفرنس طلب کی اور اس میں کہا کہ ان کی واپسی وحدتِ مغربی پاکستان کے خلاف احتجاج ہے۔ انہوں نے پھر ریفرنڈم کا مطالبہ کیا، اور کہا کہ ۱۹۲۱ء کا معاہدہ، جس کی رو سے افغانستان اور ہندوستان (اور تقسیم کے بعد، افغانستان اور پاکستان) کے درمیان موجودہ سرحد تسلیم ہوئی تھی، ان کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ (طلوعِ اسلام بابت ۵ نومبر ۱۹۵۵ء)

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ خان عبدالغفار خان اور ان کے رفقاء کے ساتھ افغانستان کے تعلقات کس قسم کے ہیں، اور افغانستان کے پاکستان کے خلاف کس قسم کے عزائم ہیں۔

بیرونی ممالک میں تحریکِ پختونستان

موجودہ سیاست کا عام انداز یہ ہے کہ جس حکومت کو اپنے ملک میں ناکامی ہوتی ہے، وہ کسی دوسرے ملک میں اپنی عارضی حکومت قائم کر لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی انداز تحریکِ پختونستان کے مؤیدین نے اختیار کیا۔ ان کے لئے جب پاکستان میں حالات مساعد نہ رہے تو انہوں نے بیرونِ ملک اپنی تنظیم کے اکھاڑے قائم کئے۔ ۱۹۵۵ء میں

امریکہ سے کچھ لٹریچر موصول ہوا جس سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک آزاد پختونستان سوسائٹی قائم کی گئی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر کیلیفورنیا کا شہر سکرامنٹو ہے۔ اس سوسائٹی کی طرف سے شائع شدہ ایک پمفلٹ میں بتایا گیا کہ وہاں ۲ ستمبر ۱۹۵۵ء کو پختونستان کا یوم آزادی منایا گیا اور اس میں اس تحریک کے صدر، ڈاکٹر اورنگ شاہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس تحریک کے مقاصد اور عزائم کیا ہیں۔ ہفتہ وار طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت ۵ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کی اس پوری کی پوری تقریر کو شائع کیا تھا۔ وہ تقریر طول طویل ہے اس لئے ہم اسے یہاں نقل نہیں کر سکتے۔ اس کے صرف نمایاں نکات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہوں نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا:۔۔۔

> آج دنیا میں جہاں جہاں بھی پختون اور افغان قوموں کے افراد بستے ہیں وہ اس تقریب آزادی کو بڑی مسرت سے منا رہے ہیں .... چھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ آج کے دن پختونستان کے باشندوں نے اپنے اس عزم راسخ اور نصب العین زندگی کا اعلان کیا کہ وہ مکمل آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور اقوام عالم میں ایک خود مختار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گے۔
>
> ہندوستان کی آزادی کے بعد پختونوں کا خیال تھا کہ انہیں ایک آزاد وحدت کی حیثیت سے حقوق خود اختیاری مل جائیں گے، جس طرح برما اور سیلون کو ملے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں ان حقوق سے محروم رکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ اپنی آواز بلند کریں اور حصول آزادی کے لئے ایک قوم کی حیثیت سے کھڑے ہو جائیں۔ چونکہ پختونستان کے رہنے والے افغان ہیں۔ اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ افغانستان ان کے اس مطالبہ کی تائید کرتا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ چنانچہ افغانستان کی حکومت اور وہاں کے باشندوں نے اس بات کا حلف لیا کہ وہ اس مطالبہ کی تائید بھی کریں گے اور اس کے حصول میں مدد بھی دیں گے۔

یہ تھا ڈاکٹر اورنگ شاہ صاحب کی تقریر کا ملخص۔ تقریر کے آخر میں ایک مختصر سا نوٹ بھی تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ:

> پختونستان کے معنی ہیں پختون لوگوں کا ملک .... یہ ملک سرحد افغانستان اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے .... اور شمال میں چترال اور جنوب میں بلوچستان تک پھیلا ہوا ہے .... پختون نسل کے لوگوں کا مذہب (؟) زبان، کلچر، طریق زندگی اور رسوم و رواج سب الگ ہیں اور شمال اور مشرقی علاقوں کے لوگوں سے بالکل مختلف۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد اس سوسائٹی کا کیا حشر ہوا، البتہ ۱۹۷۴ء میں اسی قسم کا یوم آزادی، یکم ستمبر ۱۹۷۴ء کو، نئی دہلی کی کانسٹی ٹیوشن کلب میں منایا گیا۔ اس تقریب کی صدارت آزاد تحریک پختونستان کے روح رواں خان غازی صاحب نے کی ان کی تقریر کو جو کافی طویل تھی، اخبار مدینہ کی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت کے حوالہ سے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

> پختونوں کی تحریک آزادی میں آج کے دن کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ۲۶ جنوری کو ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہے۔

(۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو ہندوستان نے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا تھا)۔

خان غازی نے مزید کہا:

آزادی کے بین الاقوامی قانون کی رو سے اس قوم (پختون) کو حقِ خود ارادیت ملنا چاہیئے تھا جیسا کہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کی دوسری اور بڑی قوموں کو یہ حق دے دیا گیا ہے لیکن پختون قوم کو نہ صرف اس حق سے محروم رکھا گیا ہے بلکہ اسے سامراجی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ایک بالکل جدید اور خود ساختہ قوم کا ضمیمہ یا حصّہ بنا دیا گیا ہے۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ:

پاکستان کے اربابِ اقتدار کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستان کی سلامتی کا راز بھی اسی میں ہے کہ پختونستان آزاد ہو اور پختونوں کی حقیقی اور پائدار دوستی حاصل کرنے کے لئے ان کے وطن پختونستان سے اپنے سبز پرچم کو اتار کر اس پر پختون کا سُرخ پرچم لہرا دے۔

یہ تو رہیں تحریک پختونستان کی سرگرمیاں بیرونِ ملک۔ پاکستان کے اندر ان کی سرگرمیوں کی نوعیت کیا تھی، اسے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔ یہ اوائل ۱۹۷۲ء کی بات ہے جب بنگلہ دیش پاکستان سے الگ ہو چکا تھا اور مجیب (مرحوم) کی مکتی باہنی وہاں کے مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہی تھی۔ انہی دنوں روزنامہ امروز (لاہور) کی ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:

پختون زلمے

نیشنل عوامی پارٹی[۱] نے "پختون زلمے" کے نام سے پختون نوجوانوں کی تنظیم کو از سرِ نو منظم کرنا شروع کر دیا ہے۔ نیپ کے سربراہ خان عبدالولی خان تنظیم کے سربراہ ہوں گے۔ یہ تنظیم تحصیل اور ضلع کی سطح پر قائم کی جائے گی۔ خان عبدالولی خان نے زلمے کے تمام کمانڈروں سے اپنے اپنے گروپ کے ارکان کی فہرستیں طلب کر لی ہیں۔ تنظیم مکمل ہونے کے بعد، اس کے کمانڈر ان چیف، خان عبدالولی خان سالاروں کے اجلاس بلائیں گے۔ زلمے کے ارکان سُرخ ٹوپیاں پہنیں گے جب کہ کمانڈر سُرخ رنگ کی جیکٹ اور خاکی رنگ کی وردیوں میں ملبوس ہوں گے۔

یہ جنوری ۱۹۷۲ء کے آخری ہفتہ کی بات تھی۔ فروری کے پہلے ہفتہ میں، اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

نیشنل عوامی پارٹی کے صدر اور پختون نوجوانوں کی تنظیم پختون زلمے کے سپریم کمانڈر، خان عبدالولی خان نے آج یہاں سیاسی جماعتوں کی طرف سے نوجوانوں کو مسلح کرنے کے رجحان پر تشویش کا اظہار کیا اور ساتھ ہی کہا کہ اگر خدانخواستہ عوام کے ایک حصّہ نے دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تو ان کی تنظیم "پختون زلمے" کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکے گا۔ خان عبدالولی خان نے پشاور کینٹ میں پختون زلمے کے دفتر کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ نیشنل عوامی پارٹی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پُر امن اور آئینی طریقوں پر یقین رکھتی ہے لیکن اگر ہم پر کوئی بات مسلط کی گئی تو یہ باقی ماندہ پاکستان کے لئے بدترین دن ہوگا۔ (مساوات۔ ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

ازاں بعد ۱۶ فروری ۱۹۷۲ء کے پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

---

[۱] سُرخ پوش تنظیم خان عبدالولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی میں مدغم کر دی گئی تھی۔

خان عبدالولی خان نے (پشاور میں) کہا ہے کہ اگر موجودہ صورتِ حال کو بروقت بند نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ وہ خون ریزی ہوگا جس کے بعد پیپلز پارٹی کے پاس بہت تھوڑا حصہ رہ جائے گا جس پر وہ حکومت کر سکے گی۔

(ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ خبر کہاں تک صحیح تھی لیکن یہ) روزنامہ امروز کی اشاعت بابت ۸ر اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی کہ امریکی جریدے نیوز ویک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے حامیوں نے، جو افغانستان کے پٹھان قبائل کے ساتھ مل کر پختونستان کے خواب دیکھ رہے ہیں، اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ ولی خان کی پارٹی کے پاس اپنا اسلحہ خانہ ہے جس میں بغیر لائسنس کے ۲۵ ہزار ہتھیار محفوظ ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ علاقے کے تقریباً ۵۰ فی صد قبائل بھی مسلح ہیں نیشنل عوامی پارٹی نے ہمالیہ کی وادی میں جدید اسلحہ فیکٹری قائم کر رکھی ہے جو مختلف قسم کے جدید اسلحہ تیار کرنے میں مصروف ہے۔

اس کے بعد، بلوچستان کے معروف سیاسی لیڈر، سردار محمد اکبر خان بگٹی نے ۱۱ر فروری ۱۹۷۳ء کی سہ پہر لاہور کے ایک پبلک جلسہ میں، بلوچستان اور نیپ کی خفیہ تنظیموں کے متعلق ایسے انکشافات کئے جن سے ہر بہی خواہ پاکستان تھرتھرا اٹھا اس کی تفصیلات طلوع اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھیں لیکن ہم انہیں دہرانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ سوال اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ان انکشافات اور الزامات میں کس حد تک صداقت ہے؟

یہ ہیں مختصر طور پر تحریک پختونستان کے نمایاں خط و خال۔ اسے ہم نے ان واقعات کی روشنی میں مرتب کیا ہے جو پریس میں آچکے ہیں اور جن کا ہم نے حوالہ بھی دیدیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا، ہم نہ ان پر کسی قسم کا تبصرہ یا تنقید کرنا چاہتے ہیں، نہ خان عبدالولی خان کے حالیہ انٹرویو اور بیانات کے سلسلہ میں کسی بحث میں الجھنا۔ یہ مسئلہ بڑا اہم بھی ہے اور انتہائی نازک بھی۔ اس لئے ہمارے نزدیک اسے پبلک میں بحث و تمحیص کا موضوع نہیں بننا چاہئے، بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ افغانستان میں پاکستان کے خلاف ایک خطرناک محاذ قائم ہو چکا ہے اور خود ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین جمع ہیں۔ ہمارے خیال میں خان ولی خان کو ایسے نازک موقعہ پر اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہئے تھا۔

ایک دلیل

آخر میں ہم اس دلیل کا جائزہ لینا بھی ضروری خیال کرتے ہیں جسے یہ حضرات، پاکستان سے اپنی وفاشعاری کے حق میں بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں، صوبہ سرحد میں داخلہ پر پابندی کے اٹھ جانے کے بعد خان عبدالغفار خان صاحب نے مردان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

> تقدیر کی یہ ستم ظریفی عجیب ہے کہ جنہوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا انہیں وہ لوگ غدارانِ پاکستان کہہ رہے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ انگریز کے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ (طلوع اسلام۔ بابت ۶ر اگست ۱۹۵۵ء)

اسی دلیل کو اب خان عبدالولی خان بھی پیش کر رہے ہیں۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ حضرات پاکستان کے وفاشعار ہیں یا نہیں۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں ان کی پیش کردہ

دلیل کس قدر کمزور اور بودی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ چونکہ ہم نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا تھا اس لئے ہم پاکستان کے غدار کسطرح ہو سکتے ہیں؟

انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کی تحریک ہندو نے اٹھائی تھی نیشنلسٹ مسلمان (مثل خان عبدالغفار خان) ان کے لاحقہ یا ضمیمہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہندو یہ کہے کہ ہم نے انگریز کو ہندوستان سے باہر نکال دیا تھا اس لئے ہم پاکستان کے بدخواہ کسطرح ہو سکتے ہیں، تو فرمائیے! ان کی یہ دلیل کسقدر وزنی تسلیم کی جا سکے گی؟

اور آگے بڑھئے۔ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کی تحریک میں شیخ مجیب الرحمٰن (مرحوم) بھی شامل تھے۔ فرمائیے! انہیں آپ پاکستان کا وفاشعار قرار دیں گے یا غدار؟

اس کے بعد اس دلیل کا دوسرا رُخ لیجئے۔ انگریز کو ہندوستان سے نکالنا مقصود بالذات نہیں تھا۔ وہ ایک اور مقصد کے حصول کا اولیں قدم تھا۔ ہندو کے نزدیک وہ مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ اس پوزیشن میں ہو جائے گا کہ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمان کو ہمیشہ اپنا محکوم بنائے رکھے۔ جو مسلمان ان کے ہم نوا تھے وہ ان کے اس مقصد کو کامیاب بنانے میں ان کے ممد و معاون تھے۔ یہ تھیں مسلمانی کے لئے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کی خدمات جو انگریز کو ہندوستان سے نکالنے میں ہندو کے ہم نوا تھے۔ ہندو اور یہ نیشنلسٹ مسلمان دونوں پاکستان کے حصول کے سخت مخالف تھے۔ پاکستان کا حصول ان دونوں کی شکست تھی۔ مؤیدان پاکستان کے خلاف ان کے دل میں کسقدر کینہ اور نفرت کے جذبات موجزن تھے، اس کا اندازہ خان عبدالغفار خان کے اس بے ساختہ بیان سے لگ سکتا ہے جس کی رو سے انہوں نے انہیں "بھیڑیا" کہا تھا۔ سوچئے کہ کوئی انسان، بھیڑیوں کا بھی وفاشعار ہو سکتا ہے؟

ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے برعکس پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کے نزدیک انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کا مقصد یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے گا جس میں وہ قرآنی مملکت قائم کر سکیں گے۔ ہندو کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت "قابلِ فہم" تھی لیکن غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جو مسلمان اس مطالبہ کی مخالفت کرتے تھے وہ پاکستان تو ایک طرف، اسلام کے بھی کس حد تک وفاشعار تھے؟

ہم تو سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان سے دیانتداری کا تقاضا تھا کہ وہ کھلے بندوں اس کا اعتراف کرتے کہ انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد پاکستان کے ساتھ ان کی وفاشعاری یا غداری کے ثبوت کے لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے کوئی ایسا قدم تو نہیں اٹھایا جو کسی نوع سے اس مملکت کی کمزوری کا باعث ہو۔ یہی اس بحث میں ہمارے نزدیک حرفِ آخر ہے۔ اور اس کے لئے پختونستان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

ایک جانکاہ حادثہ

بزمِ طلوعِ اسلام گوجرانوالہ کے نمائندہ محترم چوہدری مقبول شوکت صاحب نے بذریعہ انگریزی خبر لکھی ہے کہ بزم کے ایک فعال کارکن حکیم فضل کریم مجیدی بوجہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم نے قرآنی تحریک کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی تھیں ان کے پیشِ نظر ان کی موت ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور نمائندہ اور اراکین بزم کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق دے۔ ادارہ اس غم میں ان کا برابر کا شریک ہے۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

حقائق وعبر۔ و۔ مراسلات

۱۔ گناہوں کے مؤاخذہ سے بچنے کی تدبیر

ہمیں ایک چھوٹا سا پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے ——— فکرِ آخرت۔ ——— یہ (مولانا) اشرف علی تھانوی کا ایک وعظ ہے۔ جسے، ناظم آباد کے عبد اللطیف۔ نامی کسی صاحب نے حسب ایماء جناب ڈاکٹر عبد الحی صاحب (خلیفہ حضرت والا تھانوی) شائع کیا گیا ہے۔ اس میں گناہوں کے مؤاخذہ سے بچنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ فرمایا:۔

> میں اس وقت تمہاری خاطر سے کہتا ہوں کہ خیر گناہ کر لو لیکن جب میں نے تمہاری ایک درخواست منظور کرلی تو تم بھی میری دو درخواستیں منظور کر لو۔ ایک تو یہ کہ گناہ کرو مگر اس کو سمجھنا گناہ اور حرام ہی، اور ایک یہ کہ سوتے وقت دن بھر کے گناہوں کا حساب کر لیا کرو کہ صبح سے اس وقت تک کیا کیا گناہ کیے۔ خصوصاً وہ گناہ جو معاش کے متعلق ہیں۔ کیونکہ مالِ حرام سب سے بڑی چیز ہے یہ تخم ہے تمام گناہوں کا۔ سو اس طرح گناہوں کو یاد کیا کرو اور زبان سے کہا کرو کہ اے اللہ ... میں بڑا نالائق ہوں، اس قابل ہوں کہ غرق کر دیا جاؤں کوئی عذر میرے پاس نہیں۔ میں نے بہت ہمت کی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی آپ مدد کیجئے اور اس خباثت سے نکال دیجئے۔ میں بڑا ایسی کام کی بات بتلاتا ہوں کہ اوّل تو اس سے وہ گناہ ہی چھوٹ جائے گا اور اگر بالفرض نہ چھوٹا اور ساری عمر اسی میں مبتلا رہے تب بھی اتنا فائدہ پہنچے گا تو مرتے وقت ایک ہی گناہ سر رہے گا کیونکہ جب روز توبہ کی جاتی ہے تو اس سے ماضی کا تو کفارہ ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ سو دن کے گناہ سر ہوتے ایک ہی دن کے رہ جائیں گے۔

اگر اُس دن کی توبہ کے فوری بعد موت واقع ہو جائے تو ایک دن کے گناہ بھی باقی نہیں رہیں گے! (طلوعِ اسلام)

ایک اور وعظ فرمایا کرتے تھے کہ کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو۔ گناہ کرو، اور جی بھر کر کرو۔ بس ایک دفعہ شروع میں درود شریف پڑھ لو، ایک بار آخر میں: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ .... (۵۵/۱۹) یہ دو سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے آپس میں ملیں گے اور تمہارے گناہوں کی کثافت کو بہا کر لے جائیں گے۔

ان بزرگوں کی باتیں نہ مان کر، یہ اُمت خواہ مخواہ گناہوں میں ملوّث ہو گئی! افسوس، صد افسوس!!

—— (۰) ——

۲- علماء کو اکٹھے ہو جانا چاہیئے

بیکار قوموں کو مشغلے کے لئے کچھ نہ کچھ ہاتھ آہی جاتا ہے۔ آج کل ہمارے مذہبی حلقوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آنکھوں کا عطیہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں جامعہ مدنیہ کے (مولانا) حامد میاں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ

اس مسئلہ پر علماء کو ایک جگہ اکٹھے ہو کر غور کرنا چاہیئے۔ بلکہ علماء جب اس مسئلہ پر غور کریں تو ڈاکٹروں کو بھی اس اجلاس میں طلب کر کے ان کی رائے لی جائے۔ (جنگ۔ مورخہ ۱/۸۲ ۔۶)

علماء کو اکٹھے کرنے پر ہمیں ایک واقعہ یاد آگیا۔ جب مفتی محمود (مرحوم) سرحد کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو انہوں نے ایک آرڈی ننس نافذ کرنا چاہا تھا جس کی رو سے حکومت کو حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ رفاہِ عامہ کی خاطر، کسی کی زمین یا مکان کو اپنے قبضہ میں لے لے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے تیسرے ہی دن، خود مفتی صاحب کی جمعیت کی مجلسِ شوریٰ نے جس کے اجلاس میں مفتی صاحب بھی شریک تھے، یہ ریزولیشن پاس کیا کہ مجوزہ آرڈی ننس اسلام کے یکسر خلاف ہے، اسے واپس لیا جائے۔ (طلوعِ اسلام بابت نومبر سنہ ۷۲ء صفحہ ۲۸)۔ یہ علماء کی ایک جمیعت کا حال ہے۔ (مولانا) حامد میاں صاحب معلوم نہیں کس دنیا میں بس رہے ہیں جو علماء سے متفقہ فیصلہ لینے کے لئے انہیں اکٹھا کرنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں!

ہم حامد میاں صاحب سے گذارش کریں گے کہ اگر انہوں نے علماء کو اکٹھا کرنا ہے تو انہیں یہ فیصلہ کرنے کے لئے اکٹھا کریں کہ نماز کی مسنون شکل کیا ہے، تاکہ اس سے وہ اختلافات ختم ہوں جن کی رو سے، ہاتھ اٹھانے اور نہ اٹھانے پر مساجد میں سر پھٹول ہوتی رہتی ہے اور بریلوی اور دیوبندی، سُنّی حنفی بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ۔۔۔۔ لیکن ان سے یہ فیصلہ قیامت تک نہیں ہو سکے گا!

وہ علماء ہی کیا ہوئے جو اکٹھے ہو جائیں!

———(۰)———

۳- مجلسِ شوریٰ کے غیر مسلم ممبر

سوال:- ہمارے ہاں جو مجلسِ شوریٰ متشکل ہوئی ہے اس کے غیر مسلم بھی ممبر ہیں۔ کیا اسلام کی رو سے یہ جائز ہے؟

جواب:- اسلام کی رو سے تو یہ قطعاً جائز نہیں۔ قرآن نے وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۴۲/۳۸) ۔۔۔۔ کہا ہے۔ یعنی وہ (مسلمان) اپنے امورِ مملکت، آپس کے (بَيۡنَهُمۡ) باہمی مشورہ سے طے کریں گے۔ "بَيۡنَهُمۡ" میں کوئی غیر مسلم شریک نہیں ہو سکتا! نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی ابوجہل شامل تھا۔ نہ خلفائے راشدین کی مجلس میں کوئی یہودی ۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کسی مخصوص معاملہ میں ان میں سے کسی سے مشورہ لیا ہو ۔۔۔۔ جیسے طب کے معاملہ میں کسی غیر مسلم طبیب سے۔

۴۔ الھدیٰ کے پروگرام میں خواتین

پاکستان ٹی۔وی پر الھدیٰ کے عنوان سے ایک مسلسل پروگرام نشر ہوتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب وعظ فرماتے ہیں۔ پچھلے دنوں یہ خبر عام ہوئی تھی کہ وہ پروگرام بند کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جنگ بابت ۸ر جنوری ۱۹۸۲ء میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے۔

> وفاقی کونسل کے نامزد رکن، ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ٹیلی ویژن پروگرام، الھدیٰ کے بند ہونے پر انہوں نے نہ تو کوئی بیان دیا اور نہ ہی کوئی انٹرویو دیا ہے۔ وہ آج نمائندہ جنگ سے بات چیت کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ الھدیٰ والوں نے ان پر زور دیا تھا کہ ان کے پروگرام میں خواتین کو بھی بٹھایا جائے۔ جس پر میں نے اعتراض کیا۔ جب ٹی۔وی والوں نے زیادہ زور دیا تو وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ خواتین کو پردہ میں بٹھایا جائے۔ لیکن ٹی۔وی والوں نے اس پر کہا کہ اگر خواتین کو پردے میں بٹھانا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ بٹھایا ہی نہ جائے۔

اب سنا ہے کہ الھدیٰ کا پروگرام بند نہیں ہوگا، جاری رہے گا۔ معلوم نہیں مفاہمت کی شرائط کیا طے پائی ہیں۔
بہر نوع، قوم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شکرگذار ہے کہ انہوں نے مرحوم مودودی صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ انہوں نے ان مشاغل کی تعلیم و تربیت بھی تو انہی سے حاصل کی تھی۔ بقولِ غالب

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی!

(o)

۵۔ جدید عائلی قوانین کا نمونہ

روزنامہ جنگ، بابت ۱۳ر جنوری ۱۹۸۲ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> کویت کی ایک عدالت کے فیصلے پر کہ اسلام شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ ناروا سلوک کی اجازت نہیں دیتا لیکن شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کو اس انداز سے پیٹ سکتا ہے کہ وہ زخمی نہ ہو، بعض علماء نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اپنی آراء کا اظہار کرنے والے علماء میں ایک جامعہ نعیمیہ کے شیخ الحدیث مولانا غلام رسول سعیدی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ فیصلہ درست ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو اس حد تک پیٹ سکتا ہے کہ وہ زخمی نہ ہو...؟

> لیکن اگر وہ اس حد سے تجاوز کر کے پیٹے گا تو اسے تاوان دینا ہوگا۔ یعنی اگر دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ اس کے پیٹنے کی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اسے ۱۸ر کلوگرام چاندی بطور تاوان ادا کرنا پڑے گی۔ اور اگر دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں تو پھر یہ تاوان ۳۶ر کلوگرام ہو جائے گا۔ اور اگر ایک آنکھ اور ناک ضائع ہو جائے تو اسے دُہرا تاوان دینا پڑے گا۔

اس کے بعد خبر میں کہا گیا ہے:۔

> جامعہ اشرفیہ کے پرنسپل مولانا عبید اللہ نے کہا ہے کہ اگر بیوی سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے (کسی دوسرے سے معانقہ یا اسی طرح کی کوئی اور دوسری غیر اسلامی حرکت) تو اسے ضربِ خفیف لگائی جا سکتی ہے۔ ایسی ضرب جس سے اسے تکلیف محسوس ہو۔

اگر مرد سے (معانقہ وغیرہ کی حرکت) سرزد ہو تو پھر ....؟

(۰)

۷۔ بیرونِ ملک جانے والے پاکستانی

سوال:۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیرون ملک جانے والے پاکستانی افراد کی اسکیم حکومت کے لئے اور خود ان افراد اور ان کے متعلقین کے لئے بڑی منفعت بخش ہے ـــــ حکومت کو اس سے غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے اور ان افراد کو اس قدر دولت، جس کا یہ کبھی تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کا جو اثر یہاں کے رہنے والے (بالخصوص ہم جیسے متوسط الحال "سفید پوش") طبقہ پر پڑ رہا ہے، اس کا کسی کو خیال نہیں۔ افراطِ زر سے مہنگائی جس قدر بڑھ رہی ہے قطع نظر اس کے، ملک کے بیشتر کاریگر افراد (معمار، بڑھئی، میکانک، خیاط۔ حتیٰ کہ عام مزدور) باہر جا چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ (مثلاً) جو معمار پہلے دس روپے یومیہ پر آسانی مل جاتا تھا (اور وہ کام مل جانے کو غنیمت سمجھتا تھا) وہ آج ساٹھ ستر روپے یومیہ پر بھی میسر نہیں آتا۔ اور اس کے ساتھ اس کی شرائط اور طور طریق بھی الگ۔ یہی حالت تمام کاریگروں کی ہے۔ گھروں کے لئے نجی ملازموں کی حالت ان سے بھی دگرگوں ہے۔ آن گھر سے دیہاتی لڑکے چار دن کے لئے آتے ہیں تو تین تین، چار چار سو روپے مشاہرے سے کم میں بات نہیں کرتے۔ اور اگر ان میں کوئی ہنڈی (ہانڈی پکانا نہیں) چلانا جانتا ہے تو اپنے آپ کو باورچی سمجھتا اور چھ سات سو روپیہ ماہوار ابتدائی مطالبہ ہوتا ہے۔ پھر ان کی طبع اس قدر نازک ہو چکی ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ مغربی ممالک میں گھر کے تمام کام کاج مشینیں کر دیتی ہیں اس لئے وہاں نجی ملازموں کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن ہمارے ہاں یہ تمام کام خود کرنے پڑتے ہیں اس لئے ملازم ناگزیر ہوتا ہے۔ طلب و رسد کا یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے ہم جیسے "دیانتدار آمدنی" والوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ اس کا کسی کو خیال ہی نہیں۔

طلوع اسلام

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے ہم حرفاً حرفاً متفق ہیں۔ لیکن اس اسکیم کا جو حقیقی نقصان رساں (بلکہ پُر از خطر) پہلو ہے اسے کسی نے سوچا ہی نہیں۔ پاکستانی آبادی کے یہ کثیر التعداد سپوت جو باہر چلے گئے ہیں (وہ) ان ممالک میں اس قدر آسائشیں محسوس کرتے ہیں کہ اپنا وطن ان کی نگاہوں میں قابلِ نفرت نہیں تو اجنبی ضرور ہو جاتا ہے۔ آپ ان میں سے کسی کو باتیں کرتے سنیں (یعنی جب وہ چھٹی پر وطن آیا ہو)۔ وہ ہر وقت اُن وطنوں کے گُن گاتے گا اور اپنے وطن کی ہر شئے اسے قابلِ نفرت دکھائی دے گی۔ اس کا نتیجہ یہ کہ

جو افراد پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی طرح اُڑ کر وہاں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے بیس بیس، تیس تیس ہزار روپیہ فریب کاروں کی نذر کر دینا بھی کوئی بات ہی نہیں، خود ان کے ماں باپ اور دیگر اعزہ کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ یہ بھی کسی طرح وہاں چلے جائیں۔ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ملک کی بیشتر آبادی کی جڑیں اس سرزمین سے اکھڑ چکی ہیں۔ ان کی وفا شعاری (LOYALTY) بیرونی ممالک کے ساتھ پیوست ہو چکی ہے۔ ان کے متعلقین بھی اُنہی ممالک کی خیر مناتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں کہ باہر گئے ہوئے، وہیں کے ہو کر رہ جائیں۔ واپس کبھی نہ آئیں۔ خود اُن کی بھی یہ حالت ہو چکی ہے کہ اگر کسی ایک ملک میں ان کے لئے حالات نامساعد ہو جاتے ہیں، تو وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے آگے ہی آگے دیکھتے ہیں۔

اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ لوگ خواہ کتنا لمبا عرصہ باہر رہیں، اُن ممالک نے ایک دن انہیں اپنے ہاں سے باہر نکالنا ہے۔ سوچئے کہ جب یہ واپس آئیں گے تو انہیں کہاں سمویا جائے گا۔ اس سے ملک کا اقتصادی نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں، اُن ممالک کی یاد اُنہیں رہ رہ کر ستائے گی اور اپنا وطن انہیں جیل خانہ نظر آئے گا، جہاں وہ مجبوراً زندگی کے دن بسر کر رہے ہوں گے۔ اس قسم کی آبادی کا ملک کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی پر جو اثر پڑ سکتا ہے، ظاہر ہے۔

ابھی اس کا ایک گوشہ اور باقی ہے۔ یہ افراد بالعموم غریب گھرانوں سے متعلق ہیں۔ جب یہ یہاں تھے تو (غریبوں کی طرح) یہ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں میں گھل مل کر رہتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں حیا اور دل میں جذبۂ ہمدردی ہوتا تھا۔ یہ دور نزدیک کے رشتہ داروں کی شادی، غمی میں شریک ہوتے تھے۔ بڑوں کا ادب، ہمجولیوں سے دوستی اور بچوں سے پیار ان کا شعارِ زندگی تھا۔ اب یہ جو وہاں سے لوٹتے ہیں تو بالکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادب و احترام، دوستی اور ہمدردی، اور پیار و محبت کی اقدار کے چشمے خشک ہو چکے ہوتے ہیں، اور زندگی کا مقصد صرف "پیسہ" رہ جاتا ہے۔ یہ اپنے رشتہ داروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پہلے جن کے ہاں میلوں کی مسافت طے کر کے پہنچتے تھے، اب توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان سے ملنے آئیں۔ اور ملیں بھی تو اس طرح جیسے کوئی چھوٹے درجے کا انسان، بلند مرتبہ شخصیت سے ملتا ہے۔ چند ہی دنوں میں "پیسہ" ان کی ذہنیت بدل دیتا ہے۔ نفسیاتی کیفیت بدل دیتا ہے۔ زندگی کی اقدار بدل دیتا ہے۔

انہیں شکایت ہوتی ہے کہ بوڑھا باپ انہیں (RECEIVE) کرنے کے لئے ایئرپورٹ پر کیوں نہیں آیا، اور انہیں ملنے والے آ کر ان کے برابر چارپائی پر کیوں بیٹھ جاتے ہیں!

یہ ہے جو اس سکیم نے ملک کی اس آبادی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ نہ اپنے ملک کے رہے ہیں، نہ اپنی قوم کے۔ نہ عزیز رشتہ داروں کے رہے ہیں، نہ دوستوں ہمسایوں کے۔ حتیٰ کہ یہ خود اپنے بھی نہیں رہے!

یہ وہ نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی، لیکن اس طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے   گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے؟

———— (۰) ————

سلیمؔ کے نام

پرویز صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اولین مخاطب، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول ان کے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے —— "سلیم کے نام خطوط" —— سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت بدل دی۔

اس سلسلہ کے، تین حصے شائع ہوئے تھے لیکن حصہ اوّل، کچھ عرصہ سے نایاب تھا۔ اب اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے جس سے تینوں جلدوں کا سیٹ مکمل ہوگیا ہے۔ پہلے اس سلسلہ کو خطِ نسخ (ٹائپ) میں چھاپا گیا تھا لیکن قارئین کے تقاضوں کے پیشِ نظر، اب اس جلد اوّل کو خوبصورت خطِ نستعلیق میں شائع کیا گیا ہے۔ باقی جلدوں کی اشاعتِ ثانیہ پر بھی یہی اسلوب اختیار کیا جائے گا۔

- جلد اوّل، عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔
- بکس بورڈ کی جلد پر ٹائٹل بڑا جاذبِ نگاہ ہے۔

تقطیع کلاں ۳۰ × ۲۰/۸ ——— ضخامت ۲۶۴ صفحات ——— قیمت -/۲۵ روپے فی جلد
(محصولڈاک -/۴ ")

○ اب ان تینوں جلدوں کی قیمت حسبِ ذیل ہوگی۔

- جلد اوّل ——— -/۲۵ روپے
- جلد دوم ——— -/۱۵ روپے
- جلد سوم ——— -/۱۵ روپے

(علاوہ محصولڈاک)

: ملنے کا پتہ :

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور